www.urducouncil.nic.in

اگست 2021 ، قیمت :- ₹10

ماهنامه

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلیکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

بچوں کی دنیا

جلد:9 شمارہ:08 اگست 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : شاہنواز محمد خرم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000
شعبہ ادارت:11-49539009
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10روپے، سالانہ/100روپے

▪ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages:64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی - 110066
فون:26109746
ای میل:sales@ncpul.in
ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز:110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدر آباد-500002
فون:040-24415194

اس شمارے میں

اداریہ — مدیر — 04
ڈاک خانہ — قارئین — 05

چراغ راہ
محض اصحاب قلم نہیں بلکہ قائدین فکر و نظر — ڈاکٹر رمیش پوکھریال — 06

مضامین
ہمارا قومی جھنڈا — شبیر احمد — 09
مجاہد آزادی اشفاق اللہ خاں — معین الدین شاہین — 11
انٹرنیٹ کی اہمیت و حقیقت — انور ادیب — 14
خط کا لطف ہی کچھ اور تھا — محمد دانش — 18
سمندری طوفان : دلچسپ حقائق — شیخ صابر — 20
کورونا اور ہم — محمد طاہر صدیقی — 22

میرا بچپن
ایسا تھا بچپن — وکیل نجیب — 24

نظمیں
گڑمبا — عطاء الرحمن طارق — 29
اذاں پرندوں کی — فراق جلالپوری — 29
اے وطن پیارے وطن — محمد رفیع انصاری — 30
اسی سے تو رونق بھرا اپنا گھر ہے — خطاب عالم — 31
امیدوں کی شمع — حامد حسین — 31

کہانیاں
آزادی — محمد سراج عظیم — 32
لوٹ کے بدھو گھر کو آئے — صدر عالم گوہر — 36
اڑتا سکھ — خان حسنین عاقب — 38
خطا میری تھی — منظر مظفر پوری — 42
کھیلنا بھی ضروری ہے — محمد ذاکر — 44

ترجمہ
تین سوال — لیوٹالسٹائی/استوتی اگروال — 46

بچوں کا کتب خانہ
حوصلوں کی اڑان — عبدالوہاب قاسمی — 50

سائنس نامہ
کورونا سے بھی خطرناک مرض میوکر مائکوسیس — محمد زیان — 52

زبان شناسی
محاورے — برج موہن دتاتریہ کیفی — 54

جنرل نالج
معلومات عامہ — 55

صحت اطفال
انجیر : انسانی افادیت کا پہلا درخت — عبدالودود انصاری — 56

کہکشاں
چمن چمن کے پھول — 59

ننھے فنکار
کووڈ لاک ڈاؤن اور ہم بچے — مائشہ — 60
بچوں کی پینٹنگ — 62

بچو! آپ اس بات سے بخوبی واقف ہوں گے کہ پندرہ اگست 1947 کو ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا تھا۔ اس لیے اس دن کو تمام باشندگانِ ہند بہت اہمیت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اسے ہر سال اگست کی پندرہویں تاریخ کو یومِ آزادی کے طور پر مناتے ہیں۔ جب ہم تاریخ آزادی کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا تھا، جیل کی صعوبتیں برداشت کی تھیں اور ایک طویل مدت تک آزادی کی لڑائی لڑی تھی۔ انھوں نے اپنی جانوں کو قربان کرنا تو گوارا کیا تھا مگر اس بات کو گوارا نہ کیا کہ اپنا وطن بیرونی طاقت کا غلام بنا رہے۔

بچو! ہمارے ملک کی آزادی کی لڑائی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حصہ لینے والے بلاتفریق مذہب و ملت تمام طبقات کے افراد تھے، جن میں مرد بھی تھے اور خواتین بھی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کئی مجاہدین کے کارہائے نمایاں تو سامنے آئے لیکن بہت سے مجاہدین آزادی ایسے بھی تھے جن کی قربانیاں گمنامی کے دھندلکوں میں روپوش رہیں اور ریکارڈ میں نہ آسکیں۔ تمام باشندگان ہند کی ذمہ داری ہے کہ معروف اور گمنام تمام مجاہدین آزادی کو خراج تحسین پیش کریں۔ اگر چہ پندرہ اگست یا چھبیس جنوری کے موقع سے مجاہدین آزادی کو ہندوستان بھر میں یاد کیا جاتا ہے مگر ان کی قربانیاں ملک کے لیے اتنی اہم اور زیادہ ہیں کہ وہ ہر دن اور ہر وقت سامنے رہنی چاہئیں تا کہ ہر شہری کے سینہ میں ملک کی خدمت کا جذبہ ہر وقت تازہ ہوتا رہے۔

بچو! آپ یوم آزادی کو فخر کے ساتھ منایئے اور اپنی خوشی و مسرت کا مظاہرہ بھی کیجئے، لیکن ساتھ ہی پندرہ اگست کے پیغام پر بھی غور کیجئے کہ پندرہ اگست ہمیں کیا سکھاتا ہے اور پندرہ اگست کے کیا کیا تقاضے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ پندرہ اگست ہمیں اپنے وطن سے محبت کرنا اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینا سکھاتا ہے۔ چنانچہ ہمارا یہ عمل ہونا چاہیے کہ ہم اپنے وطن کو مضبوط اور خوش حال بنائیں اور کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ملک کو کسی بھی سطح پر کوئی نقصان پہنچے۔ پندرہ اگست ہمیں آپسی بھائی چارے اور اخوت و یکجہتی کا پیغام بھی دیتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب سب متحد ہو کر انگریزوں کے خلاف برسرِ پیکار ہوئے تو انھیں اس ملک کو چھوڑ کر جانا پڑا۔ اتحاد و یگانگت اور اخوت و بھائی چارہ آج بھی ہمارے ملک کی سب سے بڑی خصوصیت اور طاقت ہے۔ جب تک ہم اپنی صفوں میں اتحاد و بھائی چارہ قائم رکھیں گے، اس وقت تک ہمارے ملک کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

بچو! میرا آپ کے لیے مشورہ ہے کہ آپ اپنے مطالعے میں آزادی کی تاریخ کے مطالعے کو بھی شامل کیجئے اور اپنے بڑوں سے بھی تحریک آزادی کے بارے میں جانیے۔ تاکہ آپ بڑے ہو کر اپنے ملک کی مضبوطی و سالمیت کے لیے اسی طرح مخلص و کوشاں رہیں جس طرح آپ کے آبا و اجداد ملک کو آزاد کرانے اور اسے ایک مضبوط ملک بنانے کے لیے مخلص و سرگرم رہے تھے۔ آپ ابھی چھوٹے ہیں، مگر کل بڑے ہو جائیں گے اور پورے ملک کی ذمہ داری آپ کے کاندھوں پر آجائے گی۔ اس وقت ملک کے مستقبل کا انحصار آپ پر ہوگا۔ اگر آپ کے سامنے آپ کا تابناک ماضی ہوگا تو آپ ملک کے روشن مستقبل کی تعمیر کر سکیں گے۔

آپ کا

عقیل احمد

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

'بچوں کی دنیا' جون 2021 کا شمارہ موصول ہوا۔ 62 صفحات میں کھیل کود، علم و ادب، اچھی سیکھ، سب کچھ شامل ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آکسیجن ہر جاندار کی رگ و پے میں سرایت کرجاتی ہے یعنی یہ روح کے ساتھ ساتھ حیاتِ جاویداں بھی ہے۔ اس کے علاوہ کیا ہی اچھے اچھے مضامین میں انوکھی معلومات دی گئی ہیں، لیکن 'لفظوں کی ساخت' (ص14) پر بچوں کے لیے سب سے مفید سبق ہے۔ اسی طرح محاورے (ص54) سے بچوں کو روزمرہ کی بات چیت میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اور عام معلومات (ص55) سے بچوں کے علم میں خاطر خواہ اضافہ ہوگا اور پھر یہ تمام عنوانات دلچسپ بھی ہیں اور کارآمد بھی۔ بہرحال اس ماہنامہ کا ہر ایک عنوان بچوں کی دلچسپی اور علمی لیاقت کے لیے مددگار رہے اور کیا چاہیے؟

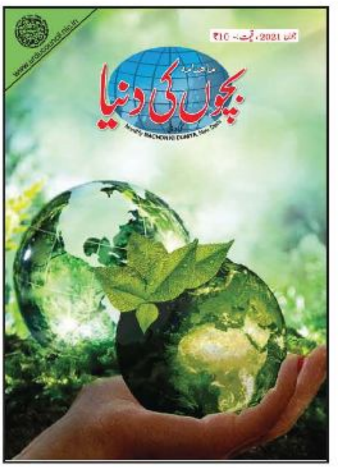

مصطفیٰ ندیم خان غوری، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

میں 'بچوں کی دنیا' کی مستقل قاری ہوں۔ یہ رسالہ بچوں کی تربیت و تعلیم کے لیے ہے لیکن پہلے میں اس کا مطالعہ کرتی ہوں پھر میرے بچے پڑھتے ہیں۔ اولاً میرے تینوں چھوٹے بچے رسالہ دیکھنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ ہر کوئی اپنی اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ شروع سے آخر تک ایک نظر بیتابی سے سب دیکھتے ہیں۔ تاہم پھر پڑھنے کے لیے میں لے لیتی ہوں اور ختم کر کے ہی دم لیتی ہوں۔ پھر دونوں بیٹیاں پڑھتی ہیں۔ بیٹا چھوٹا ہے وہ بلند آواز میں پڑھنے کی ضد کرتا ہے اور خود خاموشی سے بیٹھ کر سنتا ہے۔ یہ اس کا معمول ہے۔ باقی گھر کے سبھی افراد بچوں کی دنیا پڑھتے ہیں اور ہر ماہ بے صبری سے انتظار کرتے ہیں۔

'بچوں کی دنیا' کی مقبولیت کی خاص وجہ اس کے مشمولات ہیں، یہ رسالہ ادب کی سبھی اصناف کی نمائندگی کرتا ہے، آزادی، سائنس، پرندوں کی دنیا، خط و کتابت، بیماری، اخلاقی کہانیاں، بچوں کی فطرت اور اسکول سے پڑھائی کے سلسلے میں تحریریں نہایت دل پذیر ہوتی ہیں۔ اس رسالے کے ہر ایشو میں زبان و ادب سے متعلق ضرور کچھ نہ کچھ پڑھنے کو ملتا ہے جس سے ماضی میں برتے گئے اسلوب و زبان سے واقفیت ہوتی ہے۔

بازار میں 'بچوں کی دنیا' کے علاوہ بھی بہت سے رسالے آتے ہیں جو وقتاً فوقتاً میری نظروں سے گزرتے ہیں لیکن اس رسالے کے معیار کو کوئی نہیں چھو سکا۔ اولاً تو یہ دیدہ زیب ہے۔ ثانیاً دیگر رسالوں کے مقابلے اس کی قیمت نہایت قلیل ہے جس کی ہر کوئی برداشت کی قوت رکھتا ہے۔ باقی رہے اس کے مشمولات تو ان کا کسی رسالے سے موازنہ ہی نہیں ہے۔ بالآخر یہ رسالہ باذوق نسل کی تیاری کے لیے نہایت اہم ہے۔

فردوس بانو فلاحی، M-109، گلمرگ اپارٹمنٹ، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی

محض اصحاب قلم نہیں بلکہ قائدین فکر و نظر

(نوجوان قلمکاروں کے لیے وزیر اعظم کی مینٹرشپ اسکیم)

ڈاکٹر رمیش پوکھریال 'نشنک'

معاشرے میں مطالعے کے کلچر کے فروغ کے لیے مطالعے اور اس کے لیے ایک سازگار ماحول کی تشکیل یقینی طور پر معاشرے اور حکومت، دونوں کی ایک اہم ذمے داری ہے، لہٰذا کتابوں اور مواد مطالعہ خواہ طبع شدہ ہوں یا ڈیجیٹل شکل میں ان تک رسائی ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کا طبعی نتیجہ ہے، جو پڑھتا ہے، سوچتا ہے اور نئے خیالات کو آگے بڑھاتا ہے۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ مطالعہ کرنے والے معاشرے کو نئے تناظرات، نئے مواد مطالعہ اور ایک ایسے ماحول کی ضرورت ہوتی ہے جو نئے خیالات اور نئے مواد کو قبول کر سکے۔ اسی لیے تو ہمارے محترم وزیر اعظم، جناب نریندر مودی کہتے ہیں ''جس ملک کے شہری مطالعہ کرتے ہیں، وہی دنیا کی قیادت کرتے ہیں۔''

اس تناظر میں، ہندوستان کے دور اندیش وزیر اعظم کی سربراہی میں نوجوانوں (نوجوان، ابھرتے ہوئے اور ہمہ جہت مصنفین (YUVA, Young, Upcoming and Versatile Authors) کے لیے وزیر اعظم مینٹرشپ اسکیم اصحاب قلم کی ایک نئی نسل کی تشکیل کے ذریعے ہندوستان اور باہر کے عام قارئین کے سامنے قومی امنگوں کو پیش کرنے میں سنگ میل ثابت ہوگی۔

بلاشبہ لکھنا ایک آرٹ ہے، لیکن لکھنے کا فن بھی ایک ہنر ہے۔ اسے بالکل صحیح وقت پر صحیح سمت میں، اصلاح اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ مستقبل کے اصحاب قلم کا اندرونی اضطراب اور بھی زیادہ کارآمد طریقے سے صحیح سمت و جہت حاصل کر سکے۔ جیسا کہ کسی نے کہا ہے کہ تحریر کے بارے میں سب سے شاندار تضاد یہ ہے کہ کوئی شخص کچھ اظہار کرنے کے لیے ان لفظوں کے استعمال کی کوشش کرتا ہے جنھیں وہ الفاظ خود ہی پوری طرح سے اظہار نہیں کر پاتے، اس لیے کہا جاتا ہے کہ تحریر و تخلیق صرف الفاظ اور قواعد کی ہی ترتیب نہیں ہے، بلکہ جذباتی وسائل اسے سنوارتے ہیں، جو کسی خیال یا اسٹوری لائن کو بنانے میں معاون ہوتے ہیں۔ ایک مصنف کی حیثیت سے اس اسکیم سے وابستہ ہونے پر میں بے حد خوشی محسوس کر رہا ہوں اور حکومت ہند کے وزیر تعلیم ہونے کے ناطے میں اسے ایک کامیاب منصوبہ بنانے میں پوری ایمانداری سے پابند عہد ہوں۔

درحقیقت یہ واضح کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ اسکیم نہ صرف نوجوان قلمکاروں کے لیے ایک پلیٹ فارم تیار کرنے

سے متعلق ہے، بلکہ اس اہم کردار کے سلسلے میں ہے جسے وہ ہماری معاشرتی، ثقافتی اور فکری زندگی میں نبھاتے ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ جو اپنے تخلیق کاروں کو جگہ اور پلیٹ فارم، یہاں تک کہ اسکالرشپ اور رائلٹی کی شکل میں محنتانہ سے متعلق فائدہ پہنچانے کا خواہشمند ہو، یقیناً وہ سماج اپنے ثقافتی اور ادبی ورثے کا احترام کرتا ہے۔ اگر نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا (مرکزی وزارت تعلیم کے تحت سرگرم کار) جیسا کوئی قومی ادارہ ان 75 نوجوان مصنّفین کی تحریروں کی اشاعت و ترویج کرے گا تو یہ آنے والے وقت میں نہ صرف ان 75 نوجوان مصنّفین، بلکہ قلمکاروں اور دانشوروں کی ایک پوری کہکشاں کو متاثر کرے گا۔

یہ لکھے بغیر بات ادھوری رہے گی کہ مصنّفین کی ایک قومی مینٹر شپ اسکیم سبھی اہم ہندوستانی زبانوں کے اصحاب قلم کو ایک پلیٹ فارم مہیا کرانے پر زور دیتے ہوئے یقین دلاتی ہے کہ کثیر لسانی تانے بانے والا یہ ملک مستقبل کے اپنے قلمکاروں کو قابل قدر بصیرت فراہم کرے گا۔ ایسی بصیرت، جس کے بارے میں کسی خاص زبان سے وابستہ مصنف کے فہم و ادراک کی خاکہ گری میں ایک طویل عرصہ لگ جاتا ہے۔

نوجوان اصحابِ قلم میں ملک کے کثیر لسانی تانے بانے کے بارے میں صحیح تفہیم اور نقطۂ نظر ان میں ہندوستان کی پیچیدہ حقیقت اور متنوع الابعاد زاویوں کی مزید بہتر تفہیم فراہم کرسکتا ہے اور جو اس ملک کے ثقافتی اور ادبی ورثے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس تناظر میں، یہ قومی تعلیمی پالیسی، 2020 کے مجموعی نقطۂ نظر کے ساتھ مل جاتا ہے، جو اس کثیر لسانیت اور تنقیدی اور تخلیقی فکر پر زور دیتی ہے۔

یہ کہا جاتا ہے کہ خالی صفحات سے ایک صاحبِ قلم پیدا نہیں ہوسکتا، لیکن یقینی طور پر غلط لکھے ہوئے صفحات سے ایک صاحب قلم کی تخلیق کی جاسکتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہم میں سے کئی لوگ کہانی سنانے کی خواہش رکھتے ہیں، بھلے وہ آپ بیتی ہو یا جگ بیتی یا اس کا تعلق اس سماج سے ہو جس میں ہم رہتے ہیں، یا ہمارے ماضی سے متعلق ہو۔

'یووا' کے لیے وزیر اعظم کی مینٹر شپ اسکیم 30 سال سے نیچے کے مستقبل کے قلمکاروں کو یہ نادر و نایاب موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا گہرا مطالعہ کریں، اور ان واقعات و سانحات میں پوشیدہ گوہر آبدار باہر لائیں جو اب تک مخفی ہیں۔ وہ اپنی کہانیوں میں ایسے کچھ انجان یا نامعلوم ہیروز کو جوڑ سکتے ہیں جنھوں نے ملک کے کسی دور دراز کے علاقے میں رہ کر اپنی سطح پر ایسا اہم کردار ادا کیا ہو جو قومی شعور میں اب بھی زندہ ہو اور جنھوں نے ملک کی آزادی میں اپنا بیش قیمت تعاون دیا ہو، یا کسی ثقافتی لہر یا عروج کو جوڑ سکتے ہیں یا نوآبادیات کے اس دور میں معاشرتی- ثقافتی شناخت کو تلاش کرنے میں اس وسیع جوش و خروش کے اظہار کے طور پر سائنسی بصیرت سے وابستہ کسی بھی واقعے سے جوڑ سکتے ہیں۔

چونکہ ہم سب سال 2022 میں ہندوستان کی آزادی کے 75 ویں جشن کی طرف بڑھ رہے ہیں، سب سے اچھا تحفہ یہ ہوگا کہ ہم اپنے معاشرے کو ہندوستان کی قومی تحریک کے اب تک کے انجان پہلوؤں کو یاد کریں اور ان کی دستاویز سازی کے توسط سے ایک موافق ماحول مہیا کریں، اور اس عمل میں قلمکاروں کی ایک نئی نسل کو تیار کریں، جو معاشرے کو سمت دینے والے 'اصحاب فکر' بن سکیں، ہندوستان کے ثقافتی اور ادبی ورثے کے سفیر بن سکیں اور اس طرح ملک کی تعمیر میں اپنا طویل مدتی تعاون دے سکیں۔ یہ ہمارے محترم وزیر اعظم کے قول ''مطالعے سے بڑھ کر کوئی چیز لذت بخش نہیں اور علم سے بڑی کوئی طاقت نہیں۔'' کو صحیح معنوں میں ایک حقیقت بنائے گا۔

ترجمہ: شمس اقبال، نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

- رسالے میں بچوں کے ادیبوں کے تعارف اور تصویر کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کے ادیبوں کی ڈائرکٹری ترتیب دینے والوں کو مدد مل سکے۔
- معلومات عامہ، صحت، زبان شناسی، تاریخ، تہذیب، سائنس و ٹیکنالوجی، جغرافیہ، آثار قدیمہ اور اہم شخصیات سے متعلق تخلیقات ترجیحی طور پر شائع کی جائیں گی۔
- 'مستقبل کے قلمکار' عنوان کے تحت بچوں کی تحریروں کو خاص طور پر شائع کیا جائے گا۔
- بچوں کے ادیبوں کے انٹرویوز اور رسائل کے مدیران پر ایک سیریز شروع کی جائے گی۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

ہمارا قومی جھنڈا

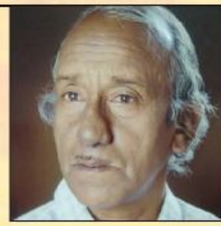

شبیر احمد

ڈاکٹر شبیر احمد کا تعلق ناگپور مہاراشٹر سے ہے۔ وہ یہاں کے تین مشہور تعلیمی اداروں (قدوائی جونیئر کالج، شری شیواجی جونیئر کالج اور انجمن جونیئر کالج) میں اردو اور عربی کی تدریس کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ بچوں کے لیے ان کی ایک کتاب 'فن تقریر' شائع ہوئی ہے۔ ان کے مضامین ماہنامہ نور، گلشن اطفال، قرطاس، اردو سماچار اور کہکشاں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ کالج میگزین کہکشاں کے نائب مدیر کی حیثیت سے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ انھیں ناگپور آرینج سٹی کی جانب سے اقبال سمّان اور یونائیٹڈ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی جانب سے مثالی مدرس کے انعامات سے نوازا جاچکا ہے۔

ہر ملک کا ایک قومی پرچم ہوا کرتا ہے جو اس کی عظمت اور شان و شوکت کو ظاہر کرتا ہے۔ ہمارا قومی پرچم ہمیں اپنی آزادی کے ساتھ اس ملک کی ایکتا اور رواداری کی یاد دلاتا ہے۔ یہ ہماری خودمختاری اور خوداعتمادی کا بھی مظہر ہے۔ ہمارا ملک 1947 میں انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا۔ اس سے پہلے یہاں انگریزوں کا قومی پرچم لہراتا تھا۔ ہمارا ملک آزاد ہوا تو اس سرزمین پر آزاد بھارت کا قومی پرچم لہرایا گیا۔ آج ہم اپنے قومی جھنڈے کو جس شکل میں دیکھتے ہیں یہ ابتدا میں ایسا نہیں تھا۔

موجودہ صورتِ حال تک پہنچتے پہنچتے اس میں لوگوں کے مشورے سے کئی تبدیلیاں کی گئیں۔ ان تبدیلیوں کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہے۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں جب ہمارے ملک پر انگریزوں کا جھنڈا 'یونین جیک'، لہرا رہا تھا۔ ہمارے ملک میں انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہونے کی کوششیں تیز ہونے لگی تھیں اور ملک میں جنگِ آزادی میں شامل ہو کر لڑنے والے مجاہدین نے عوام میں یہ امید جگادی تھی کہ جلد ہی ہمارا ملک انگریزوں کی آزادی سے چھٹکارا حاصل کرلے گا۔ لوگ ایک آزاد بھارت کا خواب دیکھنے لگے تھے، ایک ایسا ملک جس میں ہمارا اختیار ہوگا اور ہم اسے اپنے طریقے سے آگے بڑھائیں گے۔

1921 میں نیشنل کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا جس کی رہنمائی مہاتما گاندھی کررہے تھے، آندھرا پردیش کے ایک نوجوان نے انھیں ایک جھنڈا پیش کیا جس میں دو رنگ تھے۔ سرخ اور سبز۔ یہ رنگ دو طبقوں کی نمائندگی کرتے تھے۔ گاندھی جی نے اس میں سفید رنگ کا اضافہ کیا اور اس کے درمیان چرخے کا نشان شامل کیا گیا۔ چرخہ بھارت کے غریب طبقے کی نمائندگی کرتا تھا۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ بھارت ایک غریب ملک ہے اس میں بسنے والے بے شمار لوگوں کی آمدنی بے حد محدود ہے۔ اس صورت میں چرخہ ان کی معاشی حالت کو بہتر بنانے اور انھیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں مفید و کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔

1931 میں کراچی میں منعقد ہونے والے کانگریس کے اجلاس میں قومی جھنڈے کو منظوری حاصل ہوئی، مگر یہ جھنڈا کیسا ہو اس کے متعلق غور و خوض کا سلسلہ چلتا رہا۔ کئی تجاویز پیش کی

گئیں جن پر بحث و مباحثہ کے بعد کانگریس نے سہ رنگی جھنڈے کو اتفاقِ رائے سے منظور کر لیا۔ سرخ کے بجائے اس میں زعفرانی (کیسری) رنگ تھا اور درمیان میں چرخے کا علامتی نشان برقرار رہا۔

پرچم کے ان رنگوں کے متعلق الگ الگ خیالات پیش کیے گئے۔ ایک خیال یہ تھا کہ زعفرانی رنگ ہندوؤں کی، سبز مسلمانوں کی اور سفید رنگ عیسائیوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کا خیال تھا کہ ان رنگوں کو مختلف قوموں یا مذاہب سے جوڑنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ ان تمام قوموں کے اتحاد کی علامت ہے یعنی اسے قوم یا مذہب کے لیے نہیں بلکہ مشترکہ قومی نشان کے طور پر اپنایا جائے۔

ہمارا قومی جھنڈا چوکور ہے۔ اس کی چوڑائی اور لمبائی دو سے تین کے تناسب میں قائم رکھی جاتی ہے۔ چوڑائی میں اسے تین برابر حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

سب سے اوپر زعفرانی رنگ ہے، جو ہمت اور قربانی کے جذبے کی نمائندگی کرتا ہے۔ درمیان کا سفید رنگ سچائی اور خوش اخلاقی سے عبارت ہے۔ سب سے نیچے گہرا ہرا رنگ خوشحالی اور زراعت اور صنعت و حرفت کی ترقی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہمارے قومی پرچم میں موجود ان ہی تین رنگوں کے سبب اسے 'ترنگا' کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن، جو بعد میں صدر جمہوریہ ہند کے عہدے پر فائز ہوئے انھوں نے ان تین رنگوں کی تشریح اس طرح کی تھی کہ اس میں زعفرانی رنگ بے غرض خدمات اور حرص و ہوس سے پرہیز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سفید رنگ سچائی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور سبز زراعت کی علامت ہے جس سے ہماری زندگی کی ضروریات اور خوشحالی جڑی ہوئی ہے۔

آخر کار 22 جولائی 1947 کو قومی پرچم کو سرکاری طور پر منظوری دے دی گئی۔ 15/ اگست 1947 کو لال قلعے کی فصیل پر آزادی کا پرچم لہراتے ہوئے پنڈت جواہر لعل نہرو نے اسے قومی پرچم کے طور پر اپنائے جانے کا اعلان کیا تھا۔ چند دنوں بعد یہ خیال پیش کیا گیا کہ جھنڈے میں چرخے کی جگہ اشوک چکر کا نشان رکھا جائے۔ گاندھی جی نے اس تجویز کو قبول کر لیا تھا۔ اشوک چکر انصاف اور سچائی کی علامت ہے۔

ہمارے ملک کے قوانین کے مطابق ترنگا لہرانے اور اسے اتارنے کے سلسلے میں چند اصول مقرر کیے گئے ہیں۔ سب کے لیے اس کی تعظیم لازمی ہے۔ جب پرچم لہرایا جاتا ہے تو ہم کھڑے رہ کر اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ اسے لہراتے وقت جھنڈے کے زعفرانی رنگ کو اوپر رکھا جاتا ہے۔ جس جلسے میں یہ پرچم لہرایا جائے تو اس جلسے کے صدر کی کرسی سے یا صدر کے سر کی اونچائی سے پرچم کی اونچائی زیادہ ہونی چاہیے۔ ابتدا میں عام شہریوں کو اسے صرف ہمارے قومی تہواروں مثلاً یومِ آزادی اور یومِ جمہوریہ کے موقع پر لہرانے کی اجازت تھی بعد میں 2002 اور 2005 کے ترمیم شدہ اصولوں میں سپریم کورٹ کے فیصلوں کے مطابق چند تبدیلیاں کی گئیں اور دیگر مواقع پر بھی اسے لہرانے کی اجازت دی گئی۔

ہمارا یہ قومی پرچم ہمارے ملک کے اتحاد اور قومی ایکتا کی نشانی ہے۔ یہ لوگوں کے دلوں میں ملک کی محبت اور وفاداری کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ یہ اپنے ملک کے لیے قربانی کے جذبات بیدار کرتا ہے۔ قومی جھنڈے کا احترام اپنے ملک کی عظمت اور احترام کی نشانی ہے۔ یہ ہماری آزادی اور قومی رواداری کا بھی علمبردار ہے۔

■

Dr. Shabbir Ahmad
Nobel General Store
Siddharth Nagar, Habeeb Nagar, Teeka
Nagpur - 440017 (Maharashta)

مجاہدِ آزادی اشفاق اللہ خاں

معین الدین شاہین

معین الدین شاہین کا تعلق راجستھان کے مقدس شہر اجمیر سے ہے۔ وہ فی الوقت سمراٹ پرتھوی راج چوہان گورنمنٹ کالج اجمیر کے شعبۂ اردو میں بہ حیثیت ایسوسی ایٹ پروفیسر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی اہم کتابوں میں محاہد ادب: شاہد احمد جمالی، نذرِ غالب واقبال، ہماری زبان اردو، گلستانِ اردو، گلدستۂ ادب، گلزارِ ادب، صدائے اردو، انتخاب نظم ونثر، نوائے اردو اور آیئنہ ادب ہیں۔ ان کے تحقیقی مضامین مقتدر رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بچوں کے رسائل میں بھی ان کی تخلیقات چھپتی رہی ہیں۔

ہندوستان کی جنگِ آزادی کی تحریک میں جن حضرات نے مجاہدانہ کردار ادا کیا ان میں ایک اہم نام اشفاق اللہ خاں کا بھی ہے۔ انھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے شہادت دے کر یہ ثابت کردیا کہ مادرِ وطن سے بڑھ کر کوئی شے نہیں ہوتی۔ بچپن ہی سے اشفاق اللہ کے دل میں وطن پرستی کا جذبہ موجود تھا جس کا اظہار وہ وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے اسی لیے انھیں مجاہدین آزادی نے 1925 میں کاکوری معاملے میں اپنی خدمت انجام دینے کی غرض سے منتخب کیا۔ حالانکہ اسی معاملے میں انھیں پھانسی کی سزا دی گئی لیکن ان کی زبان پر حرفِ شکایت کے بجائے وطن پر مر مٹنے کی خوشی کا اظہار تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ان کا شمار ہندوستان کے مجاہدینِ آزادی کی فہرست میں نہایت ادب واحترام سے ہوتا ہے۔

اشفاق اللہ خاں کا شمار ہندوستان کے مجاہدین آزادی میں ہوتا ہے۔ ان کی ولادت 22 اکتوبر 1900 کو شاہجہاں پور (یوپی) کے ایک معزز افغانی پٹھان گھرانے میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام شفیق اللہ خاں اور والدہ کا نام مظہر النسا بیگم تھا۔ وہ اپنے چاروں بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ اسی لیے سب انھیں بہت پیار کرتے تھے اور اچھو میاں کہہ کر بلایا کرتے تھے۔

اشفاق اللہ اوائل عمری ہی سے وطن پرستی کے جذبے سے سرشار تھے۔ ان کی وطن پرستی کو اس وقت جلا ملی جب وہ شاہجہاں پور کے مشن ہائی اسکول میں زیرِ تعلیم تھے۔ یہاں ان کی ملاقات پنڈت رام پرساد بسمل سے ہوئی جو اشفاق اللہ کے بڑے بھائی کے ہم جماعت تھے اور اشفاق اللہ سے ایک

جماعت آ گئے تھے۔

گو کہ بسمل آریہ سماجی اور اشفاق اللہ مسلمان تھے لیکن مذہب کی بنا پر کبھی دونوں میں اختلاف نہیں ہوا۔ اس کا ایک سبب یہ تھا کہ دونوں کا مقصد وطن عزیز کو آزادی دلانا تھا۔ اشفاق اللہ اور بسمل ایک دوسرے سے حقیقی بھائی کی طرح محبت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اشفاق اللہ سخت بیمار ہوئے تو درد کی شدت اور بے ہوشی کے باعث رام... رام... رام۔ بڑبڑانے لگے۔ ان کے والد صاحب نے یہ سمجھا کہ اشفاق اللہ آسیب زدہ ہونے کے سبب ایسا کر رہے ہیں، چنانچہ انھوں نے ایک مولوی صاحب سے رابطہ کیا اور یہ بات انھیں بتائی۔ مولوی صاحب کو اشفاق اللہ اور بسمل کی دوستی کا علم تھا۔ انھوں نے بسمل کو بلا بھیجا۔ جیسے ہی وہ اشفاق اللہ کے گھر پہنچے تو اشفاق اللہ نے انھیں گلے سے لگا لیا اور ان سے گزارش کی کہ جب تک وہ صحت یاب نہ ہو جائیں بسمل ان کے پاس رہیں۔

اشفاق اللہ نے 1920 میں 'تحریک خلافت' کے دوران اسکول چھوڑ دیا اور عملی طور پر جہد آزادی میں شامل ہو گئے۔ وہ ہر قیمت پر ہندوستان کی آزادی کے خواہش مند تھے۔ اسی لیے وہ ہر طرح کی اذیت وصعوبت برداشت کرنے کو تیار تھے بلکہ اپنی متاع حیات تک کو قربان کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ وہ قوم پرست شاعر تھے ان کا تخلص حسرت تھا وہ اپنے عزم کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

بھلا جذبات الفت بھی کہیں مٹنے سے مٹتے ہیں
عبث ہیں دھمکیاں دار و رسن کی اور زنداں کی

ان کے اسی جذبے کا ثبوت ان کے ایک اور شعر سے بھی فراہم ہوتا ہے جو اکثر ان کی نوک زبان پر رہا کرتا تھا۔

وطن ہمارا رہے شادکام اور آزاد
ہمارا کیا ہے اگر ہم رہے، رہے نہ رہے

تحریک آزادی کو تقویت بخشنے کے لیے روپوں اور اسلحے کی اشد ضرورت تھی، چنانچہ اس ضرورت کی تکمیل کے پیش نظر شاہجہاں پور میں 7 اگست 1925 کو مجاہدین آزادی نے ایک میٹنگ کا انعقاد کیا۔ یہ میٹنگ پنڈت رام پرساد بسمل کے دولت خانے پر ہوئی جس میں چندر شیکھر آزاد، من متھ ناتھ گپت اور اشفاق اللہ خاں شریک ہوئے۔ اس میٹنگ میں کئی فیصلے لیے گئے جن میں سب سے اہم فیصلہ یہ تھا کہ مشعل آزادی کو فروزاں کرنے کے لیے مال و زر کی ضرورت اس طرح پوری کی جائے کہ برٹش حکومت ہندوستانیوں کا خون چوس چوس کر جو دولت جمع کرتی ہے اسے لوٹ لیا جائے۔ اس فیصلے کے پس پشت یہ نظریہ بھی کارفرما تھا کہ جب یہ خبر پورے ملک میں پھیلے گی تو مجاہدین آزادی کے حوصلے مزید بلند ہوں گے۔ اشفاق اللہ ابتداً اس فیصلے سے متفق نہیں تھے، لیکن جب مجاہد دوستوں نے انھیں سمجھایا کہ جس مال و زر کی لوٹ کی سعی ہم کریں گے، وہ ہمارے ہم وطنوں کا یعنی ہمارا ہی ہے، افسوس کہ انگریز اس پر قبضہ کر لیتے ہیں اور پھر یہ مال و زر ہم تحریک آزادی کے لیے ہی حاصل کریں گے۔ کسی ناجائز کام کے لیے نہیں۔ اشفاق اللہ خاں بالآخر اس فیصلے پر رضامند ہو گئے۔ اپنی اسکیم کو اشفاق اللہ اور ان کے مجاہد دوستوں نے اس طرح عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی کہ شاہجہاں پور اور لکھنؤ کے درمیان کاکوری اسٹیشن پر ریل گاڑی کو روک کر سرکاری مال و زر لوٹ لیا جائے۔ 9 اگست 1925 کو ایک پسینجر ٹرین میں آٹھ دس افراد سوار ہو کر شاہجہاں پور سے لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے۔ ان میں راجندر لاہڑی، پنڈت رام پرساد بسمل، شچیند رناتھ بخشی اور اشفاق اللہ خاں شامل تھے۔ یہ حضرات الگ الگ کمپارٹمنٹ میں بیٹھے۔ ان کے پاس ہتھیار اور تجوری توڑنے کے اوزار بھی

تھے۔ ان لوگوں نے عالم نگر اور کاکوری کے بیچ چین کھینچ کر ٹرین کو روک لیا۔ حتیٰ کہ پولس گارڈ اور ڈرائیور کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اسی دوران اشفاق اللہ نے تجوری توڑ کر سارا مال وزر حاصل کرلیا۔ اپنا کام کر کے تمام مجاہدین آزادی فرار ہو گئے۔ افسوس کہ رام پرساد بسمل کے دو دوست نما غداروں نے پولس کو تمام واقعات بتا دیے اور بسمل کو گرفتار کرلیا گیا۔

اشفاق اللہ کئی دنوں تک کھیتوں میں چھپتے رہے اور بعد ازاں بڑی مشکل سے بنارس پہنچے۔ وہ کچھ دنوں بنارس میں رہے پھر ڈالٹن گنج (بہار) جا پہنچے۔ یہاں انھوں نے ایک اسکول میں مدرسی شروع کی۔ چند ماہ ڈالٹن گنج میں رہنے کے بعد وہ دہلی آ گئے۔ بسمل کی طرح آپ بھی ایک دوست نما غدار کی غداری کا شکار ہوئے۔ انھیں 8 ستمبر 1926 کو گرفتار کر کے لکھنؤ لایا گیا۔ لکھنؤ جیل میں ایک افسر نے ان سے کہا کہ اشفاق اللہ کاکوری معاملے کا تمام الزام رام پرساد بسمل پر لگا دیں تو انھیں معافی مل سکتی ہے لیکن اشفاق اللہ نے صاف منع کر دیا کہ میں وطن پرست ہوں غدار نہیں۔ کاکوری معاملے میں اشفاق اللہ اور ان کے دیگر ساتھیوں پر مشترکہ طور پر مقدمہ چلایا گیا اور مختلف الزامات کے پیش نظر انھیں پھانسی کی سزا سنائی گئی۔ اسی لیے اشفاق اللہ کو 'شہید کاکوری' بھی کہا جاتا ہے۔

پھانسی کی سزا سے ایک روز قبل ان کے چند دوست احباب اور رشتے داران سے ملنے جیل پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ اشفاق اللہ کے چہرے پر کسی طرح کی شکن نہیں تھی بلکہ وہ بڑے ہشاش بشاش دکھائی دیے۔ انھوں نے مذاقاً اپنے دوستوں سے کہا ''کل میری شادی ہونے والی ہے'' سبحان اللہ اسے کہتے ہیں سچی وطن پرستی۔ انھیں موت کا مطلق خوف نہ تھا بلکہ ان کی تو یہی آرزو تھی کہ۔

کچھ آرزو نہیں ہے، ہے آرزو تو یہ ہے
رکھ دے کوئی ذرا سی خاکِ وطن کفن میں

پھانسی کے روز یعنی 19 دسمبر 1927 کو اشفاق اللہ صبح جلدی بیدار ہوئے۔ غسل کیا، فجر کی نماز پڑھی اور پھر تلاوت قرآن پاک میں مشغول ہو گئے۔ صبح چھ بجے انھیں پھانسی کے لیے لے جانے لگے تو انھوں نے ایک جھولے میں قرآن شریف رکھ کر اپنے سینے پر لگا لیا۔ ان کی زبان پر تلاوت قرآن پاک تھی اور قدم پھانسی کے تختے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انھوں نے پھانسی کے پھندے کو بوسہ دیا اور بلند آواز میں کہا ''میرے ہاتھ کسی شخص کے خون میں رنگے ہوئے نہیں، مجھ پر لگائے گئے تمام الزامات غلط ہیں۔ اللہ کی عدالت میں مجھے انصاف ملے گا۔''

انھوں نے جلاد کو بھی زحمت دینا پسند نہ کی اور خود ہی پھانسی کا پھندہ اپنے گلے میں ڈال لیا اور پھر انھیں پھانسی دی گئی۔ شہادت کے بعد ان کے جسد خاکی کو شاہجہاں پور تکفین و تدفین کے لیے لایا گیا۔

اشفاق اللہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے وہ بارہا اپنے اہل وطن سے گزارش کرتے تھے کہ مذہبی فسادات سے دور رہیں اور کندھے سے کندھا ملا کر وطن عزیز کی آزادی کے لیے کوشش کریں۔

آج ہمارے ملک کو اشفاق اللہ خاں جیسے سچے اور پکے دیش بھگتوں کی ضرورت ہے تاکہ ہندوستانی تہذیب وتمدن کا عزو وقار قائم رہے۔

■

(Dr.) Moinuddin Shaheen
395-A, Azad Nagar
Kotra, Pushkar Road
Ajmer - 305001 (Rajasthan)

انٹرنیٹ کی اہمیت وحقیقت

انور ادیب

پیارے بچو! آج میں آپ کو انٹرنیٹ اور اس سے جڑی ہوئی کچھ چیزوں کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں۔ انفارمیشن ٹکنالوجی کے اس زمانے میں ان کا جاننا آپ کے لیے فائدہ مند ہے۔

انٹرنیٹ کمپیوٹروں کے ایک مربوط جال کا نام ہے جو ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے اور جو چند مخصوص پروگراموں کی بنیاد پر اصطلاحات کی ترسیل کرتا ہے۔

کمپیوٹر کا گروپ جو باہم جڑ کر انفارمیشن کی آپس میں حصے داری کرتا ہے، اسے کمپیوٹر نیٹ ورک کہتے ہیں۔ اس نیٹ ورک کی مثال انٹرنیٹ ہے، اس کی ابتدا 1969 میں امریکہ میں شعبہ دفاع کے ذریعے ہوئی، اس وقت اس کا نام Arpanet تھا جو 1973 میں انٹرنیٹ کہلایا، شعبہ دفاع کے امریکی سائنسداں ونٹ سرف(Vintcerf) نے اس کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا تھا، اس لیے اسے بابائے انٹرنیٹ(Father of Internet) کہا جاتا ہے۔

ہندوستان میں انٹرنیٹ سروس کا اغاز ویدیش سنچار نگم لمیٹڈ(VSNL) نے 15/اگست 1995 میں کیا۔

انٹرنیٹ سے جڑی ہوئی جن دو اہم چیزوں کے متعلق جاننا ضروری ہے یہ ہیں www اور Website، www، World wide web کا مخفف ہے، اس میں معلومات (Information) کا زبردست ذخیرہ جمع ہے۔ ان معلومات کو جب ایک شخص یا ادارہ(Organisation) چلاتا ہے تو اسے ویب سائٹ کہا جاتا ہے۔ ویب بچوں کے درمیان نہ دکھائی دینے والے مکڑی کے جالے کی طرح جو کنکشن ہوتے ہیں، انھیں ورلڈ وائڈ کہا جاتا ہے۔ انٹرنیٹ کے استعمال کرنے والوں کے درمیان http(Hypertex Transfer ایک یا

ایک سے زائد ویب سائٹ استعمال کرنے والا کمپیوٹر Host یا server کہلاتا ہے۔

انٹرنیٹ کے بہت سارے فائدوں میں ایک فائدہ ای میل (Electronic Mail) کی سہولت ہے، ای میل کے پتے میں ایک نشان @ ہوتا ہے جسے Ray Tamlinion نامی سائنس داں نے 1971 میں ایجاد کیا۔

کمپیوٹر میں جمع معلومات کی چوری یا ناجائز استعمال بھی ہوتا ہے، جسے Hacking کہتے ہیں اور کسی پروگرام کو تباہ کرنے کے لیے اس کی مرضی کے خلاف یعنی اس کی لاعلمی میں ایک کوڈ یا پروگرام داخل کر دیا جاتا ہے اسے کمپیوٹر کا Virus کہا جاتا ہے۔ وائرس جس طرح تندرست جسم کو نقصان پہنچا کر بیمار کر دیتا ہے، اسی طرح یہ وائرس کمپیوٹر کے پروگرام کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔ وائرس انٹرنیٹ کے ذریعے دوسرے کمپیوٹر کے پروگرام کو بھی تباہ کر دیتا ہے۔

چند مشہور ویب سائٹیں

- گوگل (Google)، Gmail.com، 1997 میں Segey Brin نے گوگل سرچ انجن بنایا۔ 1998 میں Google Technology Incorp کی بنیاد پڑی۔ اور 2004 میں Gmail شروع کیا گیا۔
- یاہو Yahoo.com اسے Jerry Yang اور David Filo نے 1994 میں شروع کیا۔
- آسک Ask.com، 1996 میں David War or Garrett Gruner نے لاؤنچ کیا۔
- ریڈف Rediff.com اس Indian Based ویب سائٹ کا قیام 1996 میں عمل میں آیا۔
- فلکر Flicker.com
- ہاٹ میل Hotmail.com 1996 میں شروع کیا گیا۔

چند مشہور IT کمپنیاں:

- (International Business Machine) IBM اس امریکی آئی ٹی کمپنی کا شمار دنیا کی چند بڑی کمپنیوں میں ہوتا ہے۔ 1986 میں ہرمن ہو لیرتھ (Herman Holerith) نامی ایک امریکی سائنس داں نے Tabulating Machine Company کے نام سے ایک کمپنی قائم کی جو 1911 میں چارلس فلنٹ (Charles Flint) کے ہاتھوں بک گئی اور 1924 میں اس کا نام IBM پڑا۔ ATM (Automatic Teller Machine) اس کمپنی کی ایجاد ہے جسے سافٹ ویئر بنانے والی یہ دنیا کی دوسری سب سے بڑی کمپنی ہے۔ اس میدان میں بل گیٹس کی مائیکروسوفٹ کو اولیت حاصل ہے۔
- Microsoft کارپوریشن سافٹ ویئر بنانے والی یہ دنیا کی سب سے بڑی کمپنی ہے، جسے امریکی سائنس داں بل گیٹس (پیدائش 1965) نے اپنے رفیق کار پال ایلن (Paul Allen) کے ساتھ مل کر 1974 میں قائم کیا۔ 1955 میں بل گیٹس نے The Road Ahead کے نام سے ایک کتاب لکھی جو بے حد مشہور ہوئی۔ وہ ایک دردمند انسان ہیں انہوں نے فلاحی کاموں کے لیے ایک فاؤنڈیشن قائم کیا۔
- Apple کارپوریشن۔ اس کمپنی کا بانی جابس (-1955 2011, Steve Jobs) تھا۔ اس نے اپنے رفیق کار اسٹیو وزنیاک (Steve Woznaik) کے ساتھ مل کر 1976 میں اس کی بنیاد ڈالی اور اپنا پہلا کمپیوٹر ایپل بنایا اور 1977 میں ایپل II بنایا۔ اس کمپنی کے مقبول ہونے میں میکن ٹوش کمپیوٹر (Machintosh) ہے جو 1984 میں بنایا

گیا۔ اس کے علاوہ آئی پوڈ (IPOD) آئی فون (IPhone) آئی پیڈ (IPad) شامل ہیں۔

چند بے حد مقبول سو شل نیٹ ورک سائنس:

- فیس بک (Facebook) 2004 میں Mark Zuckerberg (پیدائش 1984) نے جاری کیا۔
- آرکٹ (Orkut) 2004 میں گوگل نے جاری کیا۔
- لنکڈ ان (Linked in) یہ خاص طور پر پیشہ وروں (Professional) کے لیے تیار کیا گیا ہے۔
- یو ٹیوب (Youtube) یہ ایک ویڈیو ویب سائٹ ہے، اس کا بانی ایک امریکی سافٹ ویئر انجینئر ہے جو 1979 میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ وہ ایک جرمن نژاد بنگالی ہے۔ چاڈ ہنری اور اسٹیو چن اس کے معاون رہے ہیں۔ جاوید نے پہلا ویڈیو 3/اپریل 2005 میں ایک چڑیا گھر میں بنایا۔ جس کا عنوان تھا Me at the Zoo۔
- ویکی پیڈیا (Wikipedia) یہ دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے مقبول آن لائن انسائیکلو پیڈیا ہے جسے 2001 میں جمی ویلس (Jimmy Wales) نے جاری کیا۔

Windows کا ذکر

ونڈوز ایک آپریٹنگ سسٹم ہے۔ مختلف کمپنیوں نے ونڈوز جاری کیا ہے۔ مثلاً Unilux، Microsoft، Mac، Linus۔ ان سب میں مائکروسوفٹ ونڈوز سب سے زیادہ مقبول ہے، جسے 1985 میں پہلی بار جاری کیا گیا۔ Microsoft Windows XP سب سے زیادہ استعمال ہوتا ہے، اسے 2001 میں جاری کیا گیا۔ اب Windows 7 اور Windows 8 کا دور ہے۔

موبائل فون

موبائل فون سے پہلی کال 3/اپریل 1973 میں کی گئی،

1896 میں مارکونی نے ٹیلی گراف کا آغاز کیا، 1901 میں اس نے پہلی بار بحراوقیانوس کے پار ریڈیو سگنل پہنچانے کا عملی مظاہرہ کیا، 1956 میں دنیا کا پہلا اوٹو میٹک کار سسٹم MTA سویڈن میں متعارف ہوا، 3/اپریل 1973 میں MOTOROLA کمپنی نے پہلی بار موبائل فون تیار کیا۔ یہاں سے پہلی نسل (IG) موبائل فون کا آغاز ہوا، 1990 میں دوسری نسل (2G) موبائل کا آغاز ہوا، 1993 میں موبائل ٹکنالوجی کو GSM کا نام دیا گیا۔ یہ فن لینڈ میں متعارف ہوئی۔ اسے پہلا اسمارٹ فون کہا گیا۔ 1998 سے موبائل فون میں تیزی سے ترقی ہوئی۔ اس سے بہت سی خدمات ممکن ہوسکیں، مثلاً رقم ٹرانسفر ڈیٹا کی ترسیل، انٹرنیٹ کا استعمال۔ یہیں سے موبائل فون نے تیسری نسل (3G) کا آغاز کیا، اس کا پہلا تجارتی نیٹ ورک DOCOMO NTT نے مئی 2001 میں جاپان میں متعارف کرایا۔ 1993 سے 2003 کا عرصہ Digital صدی کہلاتا ہے۔ کیونکہ اسی دور میں موبائل فون عام لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچا، اس کا رشتہ انٹرنیٹ سے جوڑنے سے اس کی صنعت میں انقلاب آگیا۔ 2003 سے اس کی مقبولیت میں غیر معمولی اضافے کا سبب یہی ہے۔ آج موبائل، ہینڈ سیٹ کال کرنے کے علاوہ انٹرنیٹ، براؤسنگ، ویڈیو میکنگ، فوٹو گرافی، سوشل میڈیا کا استعمال، نیویگیشن اور ایسے ہی دوسرے کئی کام انجام دینے میں استعمال ہورہا ہے۔

دنیا کی چند مشہور الکٹرانک کمپنیاں یہ ہیں

- Intel مشہور امریکی کمپنی
- Toshiba مشہور جاپانی کمپنی
- (HP)Hewlet Packard مشہور امریکی کمپنی فورڈ امریکی یونیورسٹی کے طالب علم ولیم ہیولٹ اور ڈیوڈ پیکر نے 1939 میں قائم کیا۔
- Nokia فن لینڈ کی اس مشہور کمپنی کو 1865 میں Fredrick Idestum نے قائم کیا۔ یہ موبائل بنانے والی دنیا کی سب سے بڑی کمپنی رہی ہے۔ اس کمپنی کو بل گیٹس کی Microsoft کمپنی نے 2013 میں خرید لیا۔
- Samsung Electronics جنوبی کوریا کی اس کمپنی کا شمار دنیا کی چند مشہور الکٹرانکس کمپنیوں میں ہوتا ہے۔

چند ہندوستانی آئی ٹی کمپنیاں یہ ہیں:

- ٹی سی ایس (Tata Consultancy Services) قیام: 1968 صدر دفتر: چنئی
- ایچ سی ایل (HCL) قیام: 1976 صدر دفتر: نوئیڈا، بانی شیوندرا (Shivinder)
- وپرو (Wipro) قیام: 1980 صدر دفتر: بنگلور، بانی عظیم پریم چند
- انفوسس (Infosys) قیام: 1981، صدر دفتر بنگلور، بانی: نرائن مورتھی
- ستیم (Satyam) قیام: 1987 صدر دفتر: سکندر آباد بانی مانگم۔

تو یہ تھا انٹرنیٹ اور اس سے جڑی ہوئی چند چیزوں کا ذکر۔ امید ہے اس کے مطالعے سے آپ کی معلومات میں اضافہ ہوا ہوگا۔

■

Dr. Anwar Adeeb
Ibrahim Manzil
Mosaddi Mohalla, Railpar
P.o: Asansol - 713301
Distt.: Paschim Bardhaman (WB)

محمد دانش

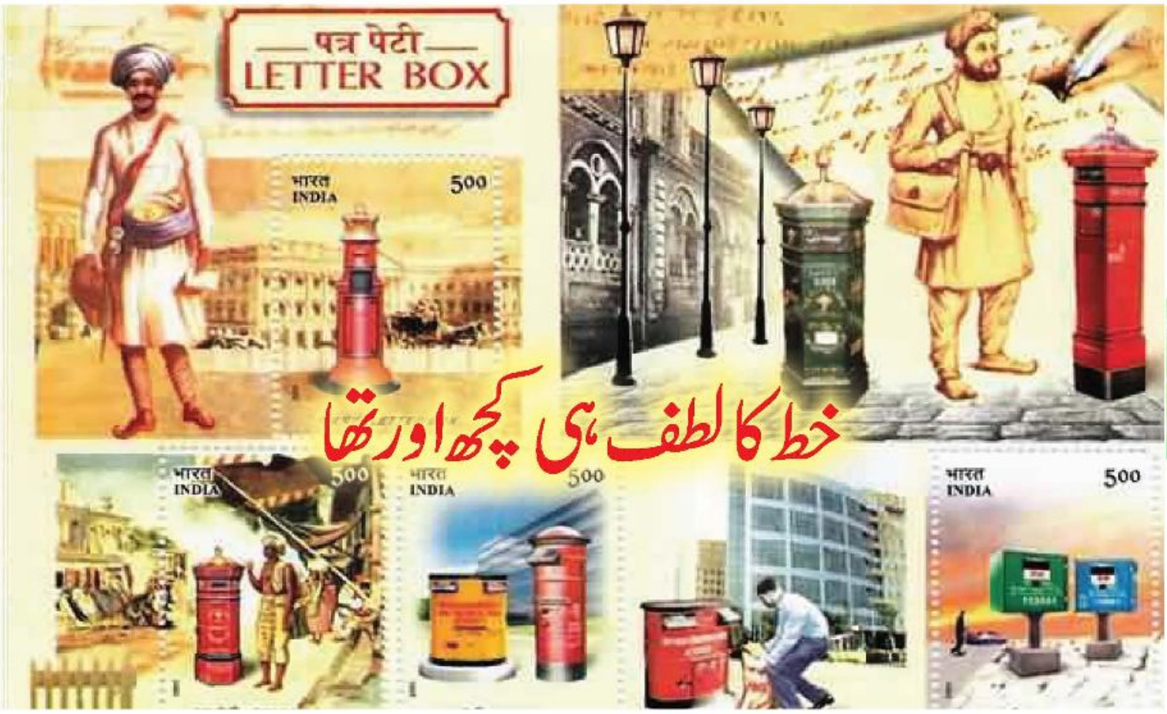

خط کا لطف ہی کچھ اور تھا

ایک زمانہ تھا جب لوگ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے پیغام بھجوانے کے لیے خط لکھا کرتے تھے جسے پہنچنے میں کافی وقت لگتا تھا۔ دو تین دن، اگر زیادہ دور ہو تو ایک ڈیڑھ ہفتہ تک لگ جاتا تھا۔ خیر پھر ٹیلی فون آیا پھر موبائیل آ گیا اور آج تو انٹرنیٹ، سوشل میڈیا ہے، ترقی یافتہ دور ہو گیا ہے۔ ہاتھ گھماتے ہی ہو جاتا ہے صرف چند سیکنڈ میں رابطہ، نہ کوئی دیر اور نا ہی کوئی انتظار لیکن...

ان سب چیزوں کے آنے سے ہم ایک بہت خوبصورت دور سے ایک بہت ہی پرلطف چیز سے دور ہو گئے یعنی خط و کتابت سے۔ بھئی وہ بھی کیا دن تھے وہ لفافے خرید کر لانا، پھر خط لکھنے بیٹھنا، سوچ سوچ کر القابات لکھنا، پھر خود پوسٹ کرنا۔ پہلے اس کے پہنچنے کا انتظار پھر جواب کا انتظار کرنا۔

اس زمانے میں دوست، احباب، شناسا، رشتے دار دور کے ہوں یا نزدیکی سبھی کو خط لکھا جاتا تھا۔ جب کہ آج تو صرف قریبی دوستوں اور قریبی رشتے داروں ہی کو فون کیا جاتا ہے۔ وہ بھی خاص موقعوں پر ہی۔ صرف کام کی باتیں ہوتی ہیں اور وہ بھی اکثر مختصر سی۔ مگر جب ایسا نہیں تھا خط لکھنے کے لیے کوئی وجہ کا ہونا ضروری تھا بھی اور نہیں بھی۔ جب دل چاہا خط لکھنے بیٹھ گئے۔ گھر میں تقریب ہو یا کوئی فنکشن اس کی دعوت کسی سفر کی روداد، کسی خوشی یا غم پر کسی کی نوکری لگی ہو اس کی خوش خبری دینی ہو یا مبارکباد وغیرہ۔

یہ خط لکھنا بھی ایک تقریب ہی ہوتی۔ گھر کا ہر فرد اپنی اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ لکھواتا، کوئی فرمائش کر دیتا ''میرے لیے وہ لانا''، ''فلاں سے یہ کہہ دینا'' وغیرہ۔ جو کسی وجہ سے خط نہیں لکھ سکتے تھے وہ کسی سے لکھوا دیتے۔ لوگ بھی بخوشی لکھ دیتے۔

وہیں ڈاکیوں کا آنا بھی کیا خوشیوں کا سماں ہوتا ہے۔ محلے میں قدم رکھتے ہی لوگ اسے گھیر لیتے اور اپنی اپنی چٹھیوں کے متعلق پوچھتے اور پھر جب وہ اپنے جادو کے تھیلے سے دبا خط نکالتا تو خوشی دوبالا ہو جاتی۔ ارے بھئی کسی اپنے کے خط کا

آنا بھی تو 'آدھی ملاقات' ہی ہوتی ہے نا! پورے گھر میں جشن کا موسم ہوتا اور پھر گھر کا کوئی فرد بڑی پھرتی سے چٹھی لے کر بھاگتا۔ عام طور پر گھر کے چھوٹے اور پھر پورا گھر اس کے پیچھے دوڑتا پھر بڑی مشکل سے منت، سماجت کر کے اسے لاتے تو کبھی کان پکڑ کر، اور پھر وہ بآواز بلند خط پڑھتا اور سارا گھر اس کے اردگرد جمع ہو جاتا۔ کبھی کبھار ڈاکیہ بھی خط پڑھ دیتا۔ کوئی خوش خبری ہوتی تو اسے کچھ بخشش بھی تھما دی جاتی تھی۔ کسی قریبی کا خط ہوتا تو اسے بار بار پڑھا جاتا۔ خطوط پر تبصرہ ہوتا۔ کبھی شکایتیں، تو کبھی دعائیں، تھوڑی محبت تھوڑی ناراضگی۔

فون پر تو آپ جتنی چاہیں اور جب تک چاہیں بات کر سکتے ہیں مگر پھر بھی دل کو تسلی نہیں ملتی مگر خط کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ انسان بڑے سکون سے، اطمینان سے اپنے دل کے سارے خیالات، جذبات، احساسات، ڈانٹ، غم، غصہ، محبت، شفقت کو صفحہ قرطاس پر رقم کر دیا کرتا تھا۔

محبت اور شفقت کی چاشنی میں ڈوبے خط کے الفاظ، القاب اور دعاؤں سے رشتوں میں مزید مٹھاس پیدا ہو جاتی۔

لوگ ان محبت ناموں کو بڑے قرینے سے لیٹر باکس یا الماریوں میں سجا کر رکھتے اور پھر یہ زندگی بھر کے لیے یادوں کے صفحات بن کر رہ جاتے۔ سالہا سال بعد بھی لوگ انھیں نکال کر پڑھتے اور پرانی یادوں کو تازہ کرتے۔ اس میں ان کے بھی خط شامل ہوتے جو اس دنیا سے ہمیں چھوڑ بہت دور چلے جا چکے ہوتے جہاں سے وہ پھر کبھی لوٹ کر ہمارے پاس نہیں آسکتے۔ ان کی پرانی تحریروں کو پڑھ کر یوں لگتا جیسے وہ پھر سے ہمارے سامنے آ گئے ہوں۔ جذبات کا ایک سیلاب آنکھوں میں امڈ پڑتا اور چند شبنمی قطرے اس دھندلی تحریر پر گر پڑتے۔ بمشکل ان خطوط کو پورا پڑھا جاتا۔

خیر...... اب تو نہ وہ القابات ہیں اور نہ وہ خط اور نا ہی وہ ڈاکیے۔ اس مصروف دنیا میں اب کہاں کسی کے پاس اتنا وقت ہے۔ ان سب چیزوں کے لیے اب تو بس سال بھر میں کبھی کبھار ہی ڈاکیہ گھر آتے ہیں وہ بھی بس کسی سرکاری یا غیر سرکاری دفاتر سے یا کوئی کمپنی، کالج یونیورسٹی وغیرہ کے 'خط' نہیں شاید لیٹر لکھنا صحیح ہوگا یا پھر کوئی نوٹس کتابیں بل اپائنٹمنٹ لیٹر وغیرہ لے کر۔

وہ دور ہی کچھ اور تھا......

اب تو بس ان دنوں کی یادیں ہی ہیں صرف یادیں—

■

Mohammad Danish Ahmad
Roop Chand Nagar
Near Husainiya Madarsa Washim Road
Akola - 444002 (Maharashtra)
Mob.: 9270765693

سمندری طوفان
دلچسپ حقائق

مضمون

18 مئی 2021 کو بحرِ عرب میں آنے والے سمندری طوفان تاؤتے نے مہاراشٹر اور گجرات کے ساحلی علاقوں میں خوب تباہی مچائی، بھاری نقصان کیا اور کئی لوگوں کی جان بھی لی۔

ماہرین نے اسے گذشتہ 20 سال کا سب سے خطرناک طوفان قرار دیا۔

اس تباہ کن طوفان 'تاؤتے' کو ابھی ایک ہفتہ بھی پورا نہ ہوا تھا کہ 26 مئی بروز بدھ کو 'یاس' نامی سمندری طوفان نے بھارت کے اوڈیشہ اور بنگال کے ساحل پر دستک دی۔ اس طوفان کی ابتدا خلیج بنگال میں ہوئی اور اس نے بدھ کی صبح اوڈیشہ کے بالاسور ساحل سے تباہی کا آغاز کر دیا۔ بعدازاں یہ بنگال کی طرف بڑھا۔ اس سمندری طوفان اور موسلا دھار بارش نے ملک کے مشرقی ساحل پر تباہی مچادی۔ اس طوفان نے کم از کم 50,000 افراد کو بے گھر کر دیا اور 1100 سے زیادہ دیہات زیرِ آب آ گئے۔ اس طرح ایک ہفتے میں بھارت کو دو سمندری طوفانوں یاس اور تاؤتے نے سخت نقصان پہنچایا اور 150 افراد کی جان لی۔

ہم ہندوستانیوں کو ایک ہی ہفتے میں دو سمندری طوفانوں کا زور برداشت کرنا پڑا۔ ان طوفانوں کے نام 'تاؤتے' اور 'یاس' جن کے بارے میں ہم نے کبھی نہیں سنا تھا، ہمیشہ کے لیے ہمیں یاد رہ گئے۔

ماضی میں بھی بحرِ عرب اور بحر ہند میں اس طرح کے طوفان آئے ہیں اور انہیں باقاعدہ نام دیے گئے ہیں۔

26 مئی بروز بدھ کو آئے سمندری طوفان کا نام عمان نے 'یاس' تجویز کیا کیونکہ اس سمندری طوفان کو نام دینے کی باری عمان کی تھی۔ یاس سے کچھ روز قبل بحرِ عرب میں آئے سمندری طوفان 'تاؤتے' کا نام جنوب مشرقی ایشیائی ملک میانمار نے تجویز کیا تھا۔

اسے پڑھنے کے بعد یہ سوال آپ کے ذہن میں ابھرے گا کہ طوفانوں کا نام کون رکھتا ہے؟ یا طوفان کو نام کیسے دیا جاتا ہے۔

سمندری طوفان کے نام کے لئے جنوبی ایشیائی ممالک کا ایک پینل ہے 'پینل اینڈ ٹراپکل سائیکلون (PTC)' اس پینل میں ابتدا میں آٹھ ملک بھارت، پاکستان، بنگلہ دیش، میانمار، تھائی لینڈ، مالدیپ، سری لنکا اور عمان ممبران تھے۔ پھر بڑھ کر یہ تعداد تیرہ ہوگئی۔ ان میں ایران، سعودی عرب، قطر، یمن اور متحدہ عرب امارات شامل کیے گئے۔

2004 سے قبل سمندری طوفانوں کو اس طرح کے نام نہیں دیئے جاتے تھے، جیسے آج دیے جاتے ہیں۔ بلکہ ماضی میں سمندری طوفانوں کو ان کی تعداد کے مطابق نمبر دیا جاتا تھا۔

1999 میں ایک سمندری طوفان پاکستان کے شہر بدین اور ٹھٹھہ سے ٹکرایا تھا اس وقت اس کو Zero 2-A نام دیا گیا تھا۔

بعد میں سن 2000 میں بھارت کی پہل پر سمندری طوفانوں کو نام دینے کا فیصلہ لیا گیا۔ پی ٹی سی میں موجود تمام ممالک کے محکمۂ موسمیات نے یہ فیصلہ کیا کہ سمندری طوفانوں کے نام ایسے ہونے چاہئیں جو یاد رکھنے میں آسان اور بولنے میں بھی سہل ہوں، نیز پی ٹی سی ممبران ممالک کے درمیان یہ بھی طے پایا کہ ہر ملک سمندری طوفان کو اپنی جانب سے ایک نام دے گا۔

اس طرح 2004 میں ایک فہرست مرتب کی گئی۔ اس فہرست میں ہر ملک نے کُل آٹھ نام اس حساب سے آٹھ ملکوں نے 64 نام دیے۔ پھر انگریزی حروف تہجی کے مطابق جس ملک کا نام پہلے آئے گا وہ سمندری طوفان کو نام دے گا یہ طے پایا۔

واضح ہو کہ 2004 میں تیار کردہ ناموں کی فہرست کے تمام 64 نام 2020 تک رکھے جا چکے ہیں۔

اس فہرست میں بھارت کے ذریعہ تجویز کردہ نام اگنی، آکاش، بجلی، جل، لہر، میگھ، ساگر اور وایو تھے۔ اس کے علاوہ کچھ دیگر ممالک کی جانب سے دیے گئے دلچسپ نام جیسے پاکستان کے فانوس، نرگس، لیلیٰ، نیلم، نیلوفر، وردا، تتلی اور بلبل مالدیپ کے ہیارو، گونو، آئلا، کیلا، مادی، ہیکا، عمان نے باز، سِدر، مرجان، ہدہد، لبان میانمار نے پیار، یائمین، ڈائے اور سری لنکا نے مالا، رشمی، بنڈو، گازہ اور پون جیسے سمندری طوفانوں کے نام رکھے تھے۔

2020 میں اس فہرست کا آخری مجوزہ نام 'ایمفین' تھا جو تھائی لینڈ کا تجویز کردہ تھا۔ یہ طوفان خلیج بنگال میں پیدا ہوا اور ہندوستان کی طرف بڑھا تھا۔

اس کے بعد پی ٹی سی کے تمام تیرہ ممبر ممالک نے گذشتہ سال سمندری طوفان کے ناموں کی ایک نئی فہرست مرتب کی ہے۔

واضح رہے کہ پی ٹی سی کے ممبران ممالک میں انگریزی حروف تہجی کے مطابق پہلے جس ملک کا نام آتا ہے وہی ملک پہلے سمندری طوفان کو نام دیتا ہے۔

مثال کے طور پر 2020 میں تیار کی گئی نئی فہرست میں پہلا نام 'نثارگا' بنگلہ دیش کی طرف سے رکھا گیا تھا۔ اس کے بعد بھارت، ایران، اور مالدیپ کا نمبر آیا تھا۔ اور حال ہی میں 18 مئی کو آئے 'تاؤتے' طوفان کو میانمار نے نام دیا جبکہ 26 مئی بروز بدھ کو آئے سمندری طوفان کو 'یاس' نام دینے کی باری عمان کی تھی۔

اگر مستقبل میں سمندری طوفان آتا ہے تو اس کا نام پاکستان کا مجوزہ نام 'گلاب' ہوگا۔

آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ ابتدائی دور میں دنیا کے کچھ حصوں میں سمندری طوفانوں کے نام مشہور مقامات، عظیم شخصیات، عوامی رہنماؤں کی بیویوں وغیرہ کے نام پر رکھے جاتے تھے۔ لیکن 1950 کی دہائی میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے خواتین کے نام سے سمندری طوفانوں کے نام رکھنے کا فیصلہ کیا اور 1953 سے 1979 کے درمیان آنے والے تمام سمندری طوفانوں کے نام خواتین کے نام پر رکھے گئے۔ بعد ازاں فیمنسٹ خواتین کی مخالفت کے نتیجے میں ایک طوفان کو مرد تو دوسرے طوفان کو خواتین کا نام دیا جانے لگا۔

سمندری طوفان کو ایک خاص نام اس لیے دیا جاتا ہے تاکہ مستقبل کے حالات وخطرات سے آگاہ کرنے والے محکمۂ موسمیات عوام کو یہ اطلاع دے سکے کہ سمندری طوفان کس سمت میں آگے بڑھ رہا ہے، اس کی رفتار کتنی ہے، اور لوگوں کو کس سمت میں محفوظ مقامات پر جانا چاہیے۔ اگر کسی طوفان کو کوئی نام نہیں دیا گیا تو عوام یہ نہیں جان پائیگی کہ کس طوفان کے بارے میں خبردار کیا جارہا ہے اور ایسے حالات میں جان مال کا زیادہ نقصان ہوسکتا ہے۔ اسی لیے سمندری طوفانوں کو نام مقامی لوگوں اور محکمۂ موسمیات کے درمیان کمیونیکیشن کو استوار بنانے کے لیے دیے جاتے ہیں۔

■

Shaikh Sabir
Muwavin Moallim
E B K, Urdu High School, Temboorni
Talluqa: Jafrabad
Distt.: Jalna - 431208 (Maharashtra)
Mob.:9421327034

کورونا اور ہم

محمد طاہر صدیقی

اکیسویں صدی میں اب تک کی سب سے بڑی پریشانی کی شکل میں سامنے آئے کرونا وائرس نے آج پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ ممالک بھی اس وائرس کی لپیٹ میں آگئے۔ اس وائرس نے نہ صرف متعدد ممالک کے لوگوں کی صحت کو متاثر کیا ہے، بلکہ اکثر ممالک کی معاشی، تعلیمی، صورتِ حال پر بھی گہرا اثر ڈالا۔

سبھی ممالک اپنی سطح پر اس سے نمٹنے میں مصروف ہیں۔ ایسی صورت حال میں ہمارا ملک بھارت بھی اس مہلک کورونا وائرس سے جنگی بنیادوں پر لڑنے کے لیے تیار ہے۔ اگرچہ اس کورونا وائرس نے ہمیں ہر شعبے میں نقصان پہنچایا ہے، مگر دوسری طرف اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ اس نے ہمیں متحد، خود انحصار حساس اور پہلے سے کہیں زیادہ با اختیار بنا دیا ہے۔ قدروں کو بخوبی سمجھنا سکھا دیا ہے۔ اس کے مناسب استعمال سے ہمیں فروغ پانے کے بہت سے نئے اختیارات بھی مل گئے ہیں۔ آج ہم صرف وسائل کے پابند نہیں ہیں بلکہ وقت کا پورا پورا استعمال بھی کرنے لگے ہیں۔

کورونا وائرس کی وجہ سے تمام اسکول، کالج، یونیورسٹی اور بڑے ادارے لاک ڈاؤن میں بند ہیں جس کے سبب اساتذہ اور طلبا کی زندگیاں براہ راست متاثر ہوئی ہیں۔ اس وبا میں ہر انسان ایک دوسرے سے ملنا گوارا نہیں کرتا یہاں تک کہ اپنے خاص جان پہچان کے لوگ بھی دور بھاگتے ہیں۔ ایسے میں ایک پرانی کہاوت بالکل صحیح ثابت ہو رہی ہے کہ ''ایک دروازہ بند ہونے سے سارے دروازے بند نہیں ہوتے ہیں'' اس پرانی کہاوت کو پرجوش اساتذہ اور بہت سے دوسرے لوگوں نے صحیح ثابت کر کے دکھایا ہے۔ ایسی صورت حال میں ایک آپشن آن لائن تعلیم کا ہے۔ آج گھر پر تعلیم حاصل کرنے کا یہ ایک محفوظ اور موثر طریقہ ہے۔ اس سے صلح کرنا کسی چیلنج سے کم نہیں تھا۔ لیکن سبھی کی انتھک کوششوں سے یہ تعلیم کا ایک موثر ذریعہ بن گیا۔ کئی طرح کے ڈیجیٹل پلیٹ فارم بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ آن لائن تعلیم کے لیے بہت سے مختلف طرح کے پلیٹ فارم استعمال کیے گئے ہیں۔ جیسے زوم ایپ، ایم ایس ٹیم، ویبکس، گوگل میٹ، اور بھی بہت سارے مختلف قسم کے ایپس دیکھنے کو ملے ہیں۔

اگر میں طالب علم کی حیثیت سے بات کروں تو اس نے نہ صرف تکنیکی مہارت بخشی بلکہ مختلف آن لائن وسائل نے ہماری تعلیم کو بھی تقویت بخشی ہے۔معاشرتی فاصلے کے قوانین پر عمل کرنے کے لیے ہمیں اتنا وقت مل گیا ہے کہ ہم خود سے سوچ اور خود سے معائنہ کر سکتے ہیں۔میں نے خود مشاہدہ بھی کیا اور اپنی اچھائیوں اور برائیوں کو سمجھنے کی کوشش کی۔اس چیلنجنگ صورت حال نے مجھے اپنی برائیوں کو کم کرنے اور بھلائیوں کو اجاگر کرنے کا موقع فراہم کیا۔آج میں اپنے مقصد کی سمت میں آگے بڑھنے اور ان مشکل حالات کو ایک چیلنج آمیز انداز سے دیکھنے کے لیے پر عزم ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ہم سب متحد ہو کر اس وبا پر قابو پالیں گے۔یہ ہمیں اپنے مقصد کے حصول سے نہیں روک سکتا۔ ہم میڈیکل اور سرکاری ہدایات پر عمل کر کے اپنے مقصد کو حاصل کرتے رہیں گے۔

اس صورت حال نے ہماری ذہنی حالت کو بھی متاثر کیا ہے۔اسکول، کالج کی طرف سے دی گئی 'آن لائن کونسلنگ' ذہنی بیماریوں کے اثرات کو کم کرنے کے لیے بہت کارآمد ثابت ہوئی ہے۔میں نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور میں نے جسمانی طور پر خود کو صحت مند رکھنے کی کوشش کی ہے۔میں اسے ایک سنہرے موقع کے طور پر دیکھ رہا ہوں جس میں میں دوبارہ اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔اپنی تعلیم کے ساتھ ہی میں مختلف مفادات پر توجہ دے رہا ہوں۔اس وبا کے دوران ہی میں نے مختلف قسم کے آن لائن مقابلہ جیسے۔کوئز، ورکشاپ، نیشنل اور انٹرنیشنل ویبی ناروں میں حصہ لے رہا ہوں۔اب میں خود کو زیادہ کارآمد محسوس کر رہا ہوں۔اس سے میرے اعتماد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔اگر ہم فہم و فراست کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں تو یقیناً ہمیں مثبت نتائج ملیں گے۔

اس عالمی وبا سے جیت حاصل کرنے کے لیے چل رہی جنگ میں جمہوریت کا چوتھا ستون جسے میڈیا کہا جاتا ہے ہم اس کے اہم کردار کو نظر انداز نہیں کر سکتے ہیں۔اس وائرس سے بچنے کے لیے سوشل میڈیا، فیس بک، واٹس ایپ، ٹویٹر وغیرہ کے ذریعے طرح طرح کے نسخے دکھائے جا رہے ہیں اور لوگوں کو آگاہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔دوسری طرف کورونا وائرس کے بارے میں کچھ تصاویر اور ویڈیو سامنے آتی رہی ہیں جو عوام کو اس بیماری سے بچنے کے لیے نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔

ایک حقیقی ویڈیو میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ کس طرح ایک لائن میں ایک دوسرے کے پاس کھڑی تیلیوں میں سے ایک کو آگ لگائی جاتی ہے یہ آگ ایک کے بعد ایک تیلی کو اپنی چپیٹ میں لینے لگتی ہے تبھی ان میں سے ایک تیلی چین توڑ کر باہر نکل جاتی ہے جس کے بعد آگ آگے پھیل نہیں پاتی ہے۔اس ویڈیو کے ذریعے لوگوں کو کہیں نہ کہیں سبق ملتا ہے، لوگوں کو آگاہ کرنے میں یہ ویڈیو ایک اہم کردار ادا کرتی ہے کہ ہم کس طرح سے معاشرتی فاصلے پیدا کر کے اس جنگ کو کیسے جیت سکتے ہیں۔لوگوں کو صحیح معلومات فراہم کرنے میں کرونا کی لڑائی میں پرنٹ میڈیا کا کردار بھی اہم رہا ہے۔میڈیا نے ملک کے کونے کونے میں لوگوں تک معلومات پہنچانے میں قابل تحسین کردار ادا کیا ہے۔

تمام مشکل چیلنجوں کی وجہ سے ہی میں اپنے اندر چھپی ہوئی خصوصیات کی نشاندہی کرنے میں کامیاب رہا۔اگر ہم محنت اور لگن کے ساتھ کسی بھی مشکل کا ڈٹ کر سامنا کریں گے تو یقیناً ہمیں مثبت نتائج ملیں گے۔

■

Mohammad Tahir Siddiqui
N/139-B, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110025

ایسا تھا بچپن

وکیل نجیب کا تعلق ناگپور، مہاراشٹر سے ہے۔ بچوں کے معروف ادیب ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے تقریباً 27 کتابیں لکھی ہیں جن میں ناول، افسانے، ڈرامے، سفرنامے شامل ہیں۔ ان کے ناول 'کمپیوٹان' کو بہت زیادہ شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ کئی اخبارات ورسائل میں قسط وار شائع ہوا۔ مہربان جن، معصوم بجوکا ان کے مشہور ناول ہیں۔ دارجلنگ کی سیر، شمالی ہند کی سیر ان کے دو اہم سفرنامے ہیں۔ جنگل کی امانت، ماں کی بددعا، ایک شخصیت پانچ کہانیاں ان کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے شاعری بھی کی ہے۔ انھیں 2016 میں ساہتیہ اکادمی کا ادب اطفال ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

وکیل نجیب

اپنے بچپن کے ایام پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اس وقت کا جو پہلا واقعہ اب تک یاد ہے وہ اس زمانے کا ہے جب شاید میری عمر 4 یا 5 سال کی رہی ہوگی۔ یہ رمضان کے مہینے کی بات ہے سنیچر کا دن اور سحری کا وقت تھا۔ کچھ شور، کچھ لوگوں کے ایک ساتھ گیت گانے کی آوازوں سے میری آنکھ کھل گئی اور میں آنکھیں ملتے ہوئے گھر کے آنگن میں آیا۔ وہیں چولھا تھا جس پر کڑاہی چڑھی ہوئی تھی اور اماں اس میں گلگلے تل رہی تھیں اور آنگن کے دروازے پر چند نوجوان لڑکے پیٹرومیکس یا گیس بتی کی روشنی میں رمضان کی شان میں کسی فلمی دھن پر کوئی قصیدہ پڑھ رہے تھے میں نے ادھ کھلے دروازے سے انھیں دیکھا، تھوڑی دیر پڑھنے کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ اماں نے مجھے گلگلے دیے میں نے گلگلے کھائے اور پھر سے جاکر اندر کے کمرے میں اپنے بستر پر سو گیا۔ میری ابتدائی عمر کا یہ واقعہ آج بھی میرے دماغ کے پردے پر روشن ہے۔

میرا رہنا مومن پورہ تکیہ محبوب شاہ میں تھا وہاں کارنر پر ہمارا خود کا مکان تھا اور وہ اب بھی موجود ہے۔ اسی مکان میں میری پیدائش ہوئی اور بچپن گزرا۔ لڑکپن کا زمانہ بھی وہیں گزرا۔

میرے والد ناگپور شہر کے بہت بڑے کپڑا مل جس کا نام امپریس ملس تھا اور جو ٹاٹا کمپنی والے پارسیوں کی ملکیت تھی وہاں سپروائزر تھے جہاں عام زبان میں انھیں مقادم کہا جاتا تھا سو میرے والد کا نام پوری مسلم آبادی میں، جو زیادہ بڑی نہیں تھی اچھا خاصا مشہور تھا۔

ہم کل سات بھائی تھے اور ہماری دو بہنیں تھیں میں چھٹے نمبر کا بیٹا تھا۔ بھائی لوگ کچھ کام کیا کرتے تھے میرے کسی بھی بھائی نے چھٹی جماعت سے آگے پڑھائی نہیں کی۔ گھر میں ہینڈلوم کا کام ہوتا تھا سمجھدار ہونے کے بعد سب انھیں کاموں میں مشغول ہو جاتے تھے۔

میں نے چوتھی کلاس کا امتحان اپنے گھر کے بالکل سامنے کی اسکول سے پاس کیا۔ اسے لال اسکول کہا جاتا تھا اور آج بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس کی دیواروں کو لال رنگ سے رنگ دیا گیا تھا سو وہ رنگ آج بھی قائم ہے۔ میرے سارے بھائیوں نے اسی اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس اسکول پر سنگِ مرمر کی سلّی پر لکھا ہوا ہے ”اس مدرسے کا سنگِ بنیاد 1934 میں رکھا گیا“ وہ پتھر کی سلّی اس عمارت کے قائم ہونے کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ وہ دومنزلہ کل چار کمروں کی عمارت ہے اور ہر کمرے میں پچاس بچے آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ بڑی خوبصورت اور پائیدار عمارت ہے۔ آج بھی اسی شان سے کھڑی ہے۔

لال اسکول سے جس کا اصل نام تھا ’بیت العلوم اردو پرائمری اسکول‘ میں نے چوتھی جماعت کا امتحان پاس کیا۔

ہمارے ددھیال کے مکان کے پاس حنیف بزمی نام کے ایک ٹیچر رہتے تھے جو ’بوہرہ جماعت‘ کے لوگوں کے اسکول ’حسامیہ بوائز مڈل اسکول‘ میں ٹیچر تھے۔ میرے والد صاحب نے ان سے بات کی اور میرا داخلہ حسامیہ اسکول میں ہو گیا جو اتواری محلے میں واقع تھا۔ وہاں کا خاص لباس یا یونیفارم علی گڑھ پائجامہ، شیروانی اور ٹوپی تھی۔ یہ پورا یونیفارم میرے لیے سلوایا گیا اور مجھے مومن پورہ سے اتواری جو دو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے روزانہ پیدل جانا پڑتا تھا۔ میرے پڑوس کے چار لڑکوں نے بھی وہیں داخلہ لیا تھا سو ہم پانچوں ساتھ ساتھ اسکول جایا اور آیا کرتے تھے۔

میں جب ساتویں جماعت میں تھا تو والد صاحب امپریس ملس سے ریٹائرڈ ہو گئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھیں اچھی خاصی رقم ملی تھی جس سے انھوں نے ہمارے پرانے کچے مکان کو نیا پختہ دومنزلہ مکان بنایا اور نیچے اسکول کی جانب ایک کمرا نکالا اور اس میں کرانے کی دکان کھول دی۔ دکان میں والد صاحب، مجھ سے بڑے بھائی عبدالعزیز اور چھٹی کے بعد میں، بیٹھا کرتے تھے۔ والد صاحب کو مطالعے کا بہت شوق تھا وہ ’دین دنیا‘ رسالہ جس کے مدیر شوکت علی فہمی ہوا کرتے تھے ہر ماہ لیا کرتے تھے اور مجھ سے اس رسالے کے مضامین پڑھوا کر سنا کرتے تھے اور میری تلفّظ کی غلطیاں درست کیا کرتے تھے۔ میرے بھائی عبدالعزیز کو بھی مطالعے کا شوق تھا وہ کرانہ دکان میں دہلی کا مشہور رسالہ ’کھلونا‘ مسلسل خریدا کرتے تھے۔ میں بھی اس رسالے کا مطالعہ کرتا تھا۔ ان سب کی وجہ سے میری زبان اچھی ہو گئی اور مطالعے میں روانی پیدا ہو گئی تھی۔

ہمارے مکان کی شمالی سمت جو گلی تھی اس سے متصل چائے کا ایک ہوٹل تھا جس کے مالک ’ادریس خلیفہ‘ تھے۔ اس

ہوٹل میں الجمعیۃ اخبار دہلی سے آیا کرتا تھا۔ مجھے وقت ملتا تھا تو میں مسلسل اس اخبار کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ اسی زمانے میں ہمارے پڑوس میں یعقوبیہ لائبریری ہوا کرتی تھی۔ شام کے اوقات میں مَیں وہاں بھی جا کر اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔

میرے بھائیوں کو ابن صفی کے ناولوں کے پڑھنے کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ فرصت کے اوقات میں مَیں بھی ان ناولوں کا مطالعہ کرلیا کرتا تھا۔ ہمارے گھر میں والد صاحب کی خریدی ہوئی داستان 'امیر حمزہ' اور 'الف لیلہ' بھی رکھی ہوئی تھی جو اکثر میرے مطالعے میں رہا کرتی تھی۔ مطالعہ کا یہ سلسلہ بچپن سے شروع ہوا، لڑکپن اور جوانی کے ایام میں اپنے عروج پر پہنچ گیا۔

حسامیہ اسکول، اردو میڈیم اسکولوں میں تعلیم کے معاملے میں بہترین سمجھا جاتا تھا۔ وہاں ڈسپلن، وقت کی پابندی، ہوم ورک وغیرہ پر بہت توجہ دی جاتی تھی۔ میں نے حسامیہ اسکول میں چار سال تعلیم حاصل کی۔ چونکہ وہ مڈل اسکول تھا، آٹھویں کے بعد وہاں تعلیم کا نظام نہیں تھا لہٰذا آٹھویں کا امتحان پاس کر کے میں نے انجمن ہائر سیکنڈری اسکول صدر میں داخلہ لیا۔ اس طرح میں ہائی اسکول کا طالب علم بن گیا۔

جہاں تک میرے بچپن کا حال ہے تو مجھے کھیلوں میں بے حد دلچسپی تھی جبکہ تعلیم کے معاملے میں مَیں اوسط سے بھی نچلے درجے کا طالب علم تھا اور میرے ساتھی تعلیم کے معاملے میں مجھ سے کافی آگے رہا کرتے تھے کھیلوں میں بڑھی ہوئی دلچسپی کی وجہ سے مجھے مڈل اسکول میں سوشل گیدرنگ کے پروگراموں میں کوئی نہ کوئی انعام ضرور ملتا تھا جب کہ میرے ساتھی اس سے محروم رہا کرتے تھے۔

مومن پورہ میں ہم جہاں رہتے تھے وہ کارنر پر بنا ہوا

مکان تھا جس میں مشرقی جانب سڑک تھی اور سڑک سے لگ کر لال اسکول تھا۔شمالی سمت میں ایک چھوٹا سا راستہ تھا اور مغربی سمت میں ایک میدان تھا۔ وہ میدان ہمارے نوجوانوں کی سب سے پسندیدہ جگہ تھی۔ صبح اٹھ کر میدان میں ہمارا کھیل کود کا عمل شروع ہو جاتا تھا اور اسکول سے آنے کے بعد مغرب کی اذان تک ہمارے کھیلوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس میدان کے مغربی جانب جنوبی کونے پر ایک مسجد ہے جسے 'مسجد بکر قصاب' کہا جاتا ہے۔ مسجد کی مغربی جانب قریش برادری کے لوگوں کی آبادی ہے۔ مسجد کی انتظامیہ کمیٹی میں قصاب برادری کے لوگ ہی شامل ہیں اسی مناسبت سے اس کا نام 'مسجد بکر قصاب' پڑا ہوا ہے۔ اسی مسجد کی وجہ سے ہمارے کھیلوں کا سلسلہ مغرب کی اذان کا وقت ہونے سے کچھ دیر پہلے ہی رک جاتا تھا کیونکہ نمازیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا۔

میرا پسندیدہ کھیل فٹ بال تھا اس چھوٹے سے میدان میں ہم ربر کی ایک چھوٹی بال سے کھیلا کرتے تھے۔ دونوں جانب سات سات کھلاڑیوں کی ایک ایک ٹیم ہوا کرتی تھی اور ہم سب نیم ہموار میدان میں ننگے پیروں سے فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ اس کے لیے ہم لوگ صبح سویرے اٹھ کر ورزش بھی کیا کرتے تھے۔ بس سمجھ لیجیے کہ فٹ بال کھیلنے کا ایک جنون ہمارے دوستوں کے سروں پر سوار رہتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میدان سے 500 گز کی دوری پر ایک بڑا میدان تھا جس کا نام ینگ مسلم فٹ بال گراؤنڈ تھا۔ اس گراؤنڈ پر ینگ مسلم فٹ بال کلب کے بڑے بڑے کھلاڑی مشق کیا کرتے تھے۔ ان دنوں شہر کے مرکزی میدان 'کستور چند پارک' میں شہر کی بڑی بڑی ٹیموں کے مقابلے ہوا کرتے تھے اور ینگ مسلم فٹ بال کلب کی وہاں نمایاں کارکردگی ہوا کرتی تھی۔

رات کے اوقات میں ہم نوجوان اسی میدان میں جمع ہوکر کبڈی کھیلا کرتے تھے۔کبڈی کے علاوہ ایک کھیل اور تھا جوصرف مہاراشٹر میں کھیلا جاتا تھا اب وہ بند ہوچکا ہے،اسے مراٹھی زبان میں ’ آٹیا پاٹیا‘ کہا جاتا تھا لیکن اپنی زبان میں اسے ’نون پاٹ‘ کہا کرتے تھے۔اس کھیل میں ایک گھر سے چکمہ دے کر دوسرے گھر میں جانا ہوتا تھا۔ بڑی ہوشیاری سے سامنے کی ٹیم کے کھلاڑی کو چکمہ دے کر آگے بڑھنا پڑتا تھا اگر اس نے روک لیا یا چھولیا تو سروس کرنے والا کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا تھا۔

سردیوں کے موسم میں پتنگ اڑانے کا موسم شروع ہوتا تو بچپن کے ان ایام میں،مَیں پوری طرح پتنگ اڑانے میں مصروف ہو جاتا تھا۔ ہمارے کھیلوں اور شوقوں کا ٹھکانہ وہی میدان ہوا کرتا تھا جو اب بھی موجود ہے جسے ’تکیہ محبوب شاہ میدان‘ کہا جاتا ہے۔اسی میدان میں بارش کے موسم میں ہم ’سلاخ گڑانی‘ کھیلا کرتے تھے۔ایک لڑکا لوہے کی سلاخ نرم گیلی زمین پر گڑاتا جاتا تھا۔اگر سلاخ زمین میں گڑنے نہ پاتی تو پھر دوسرے ساتھی کو موقع ملتا تھا اسی طرح ہم اپنی عمر کے دوستوں کے ساتھ کچے بھی کھیلنے میں لگے رہا کرتے تھے۔

ان سارے کھیلوں کے ساتھ میری تعلیم کا سلسلہ یکسوئی سے جاری رہتا تھا۔حالانکہ میں پڑھنے لکھنے میں نہ تو بہت ہوشیار تھا اور نہ ہی میری اس میں دلچسپی رہتی تھی لیکن میں کسی بھی حال میں اسکول سے ناغہ نہیں کرتا تھا۔ میری حاضری صد فی صد رہا کرتی تھی۔ نویں جماعت میں میں انگریزی زبان میں ناکام ہوگیا تھا لیکن میری حاضری کا اچھا ریکارڈ دیکھ کر مجھے ترقی دے دی گئی تھی۔

میرے والد صاحب کی تنخواہ اچھی تھی لیکن گھر کے افراد کی تعداد زیادہ تھی اس لیے عموماً تنگدستی کے حالات رہا کرتے تھے۔ جب میں مڈل اسکول جانے لگا تو چُھٹی کے اوقات میں میری والدہ ایک پائیلی (اناج ناپنے کا پرانا پیمانہ) چنا اُبال کر نمک مرچ اور تیل میں بھون کر اس پر سمار، پیاز کتر کر ڈال دیتی تھیں اور میں اسکول کے سامنے تھال میں لے کر وہ چنا فروخت کرتا تھا۔ ایک روپے کے چنے سے چھ سات روپے آجایا کرتے تھے جو گھر کے کھانے پکانے کے اخراجات کے لیے کافی ہوا کرتے تھے۔

بچپن سے میری جسامت اچھی تھی۔ چہرہ بھی اچھا تھا۔صحت مند تھا اپنے ساتھیوں میں نمایاں نظر آتا تھا۔میرے سارے بھائی مجھے بہت چاہتے تھے اور اکثر میرے لیے کپڑے سلوادیا کرتے تھے۔

اس زمانے میں یعنی 1954 سے 1958 کے درمیان ہماری بستی میں تعلیم کی طرف رغبت کم تھی بنکری کے کاروبار سے جڑا ہوا محلّہ تھا اس لیے بچے جیسے ہی سن شعور کو پہنچتے تھے انھیں گھر کے بنکری کے کاروبار میں لگا دیا جاتا تھا۔ بہت کم بچے تعلیم حاصل کر پاتے تھے میری اسکول جانے میں دلچسپی دیکھ کر مجھے اسکول میں پڑھنے دینے کی بات نہ صرف گھر میں ہوتی تھی بلکہ بستی کے بڑے لوگ بھی کہا کرتے تھے۔’وکیل‘ کو پڑھاؤ خوب پڑھاؤ۔ پڑھائی میں اس کی دلچسپی بہت ہے۔ اس طرح میری تعلیم کا سلسلہ نامساعد حالات میں بھی جاری رہا۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھتا گیا میرا رجحان تعلیم میں بڑھتا گیا۔اس طرح مڈل اسکول سے نکل کر ہائی اسکول میں گیا اور ہائی اسکول کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخلہ لیا۔ واقعی وہ ایام میری زندگی کے بہترین ایام تھے۔

■

Wakeel Najeeb
Near Lal School, Mominpura
Nagpur - 440018 (Maharashtra)
Mob.: 9373114213

عطاء الرحمن طارق

گڑمبا

لے لے کے مزے، شوق سے کھاتا ہے گُڑمبا
ہے کون، کہ جس کو نہیں بھاتا ہے، گُڑمبا
کھاتا ہے جو، کرتا ہے وہ اللہ کی تعریف
اللہ سے بندے کو مِلاتا ہے — گڑمبا
پیتا ہے کوئی چھان کے پودینے کا شربت،
گرمی کے تئیں کوئی بناتا ہے — گڑمبا
کیا چیز گُڑمبا ہے — غذا بھی ہے دوا بھی
اکسیر ہے — خفقان بھگاتا ہے گڑمبا
چٹنی بھی، مُربّہ بھی بہت خوب ہے لیکن
اس سے بھی سوا، ہم کو سہانا ہے گُڑمبا
بلّی کو نظر خواب میں جو آئے سو آئے
ہم کو تو نظر خواب میں آتا ہے گڑمبا

■

Ataur Rahman Tariq
701/3A, Vijaya Co-op. Hag. Society
Vaishali Nagar
K.K. Road, Mahalaxmi
Mumbai - 400011 (Maharashtra)

فراق جلال پوری

اذاں پرندوں کی

دل کو چھوتی زباں پرندوں کی
خوب ہیں بولیاں پرندوں کی
پیڑ پودے حسین کیوں نہ لگیں
ٹولیاں ہوں جہاں پرندوں کی
حوصلہ آسمان چھونے کا!!!
اور ننھی سی جاں پرندوں کی!!
سب سے پہلے جگاتی ہے جگ کو
صبح والی اذاں پرندوں کی!
کاش ایسے ہی مل کے سب رہتے
جیسے ہیں ٹولیاں پرندوں کی
بچو! آزاد کرکے پنجرے سے
لو دعا بے زباں پرندوں کی!
گھر تھا آباد جن کے دم سے فراق
بھیڑ ہے وہ کہاں پرندوں کی

■

Firaq Jalalpuri
Mohalla: Qazipura
Post: Jalalpur
Distt.: Abbedkar Nagar - 224149 (UP)
Mob.: 9758772746

محمد رفیع انصاری

اے وطن، پیارے وطن

اے وطن، پیارے وطن، میرے وطن، پیارے وطن
یہ ترے کھیت، یہ ندیاں، یہ ترے کوہ و دمن
گلشنِ ہند کے دل کش ہیں بہت سر و سمن
اے وطن پیارے وطن

کیف پرور یہ گھٹائیں، یہ ہوائیں یہ پھوار
کلیوں کلیوں پہ جوانی ہے تو پھولوں پہ نکھار
کتنا پھیلا ہوا ہے دور تلک تیرا گگن
اے وطن پیارے وطن

تیری مٹی میں ہیں فطرت کے ہزاروں منظر
سچ تو یہ ہے کہ نہیں کوئی بھی تجھ سے بڑھ کر
دل کو خوش رکھنے کی خاطر ہے بہت تیری لگن
اے وطن، پیارے وطن

دہر میں سب کی پسندیدہ ہے بس تیری ادا
تجھ پہ ہے سایہ فگن کتنے بزرگوں کی دعا
امن و خوشحالی کے ضامن ہیں ترے گنگ و جمن
اے وطن، پیارے وطن

تیرا پرچم ہے صحیح معنوں میں عظمت کا نشاں
تجھ سے اچھی نہیں دنیا میں کوئی جائے اماں
اک زمانے میں ہے مشہور ترا اپنا پن
اے وطن، پیارے وطن

ہے دعا یہ کہ سلامت رہے خوشیوں کا گھر
اور ہرگز نہ لگے اس کو زمانے کی نظر
ایکتا اپنا سبق، اپنی وفا اپنا دھن
اے وطن پیارے وطن، میرے وطن پیارے وطن

■

Mohd Rafee Ansari
Al-Madni 734 Bhusar Mohallah
Bhiwandi - 421308
Distt.: Thane (Maharashtra)

خطاب عالم شاذ

اسی سے تو رونق بھرا اپنا گھر ہے

یہ چھوٹی سی بچی شکیبہ سحر ہے
اسی سے تو رونق بھرا اپنا گھر ہے
بڑی ممی، پاپا کی ہے لاڈلی یہ
محبت میں ان کی ہوئی یہ نِڈر ہے
یہ چاچا کی جانب اچانک ہی دوڑے
چچی کا بھی اس پر بڑا ہی اثر ہے
کرے نقل ہے اس میں رکھتی مہارت
ابھی محض اک سال اس کی عمر ہے
یہ کرنے لگی بات جب فون سے تب
لگے ہے کہ اس پہ کوئی تو سحر ہے
یہ جھومے اذاں سے تو گیتوں پہ ناچے
اسے دین دنیا کی جیسے خبر ہے

■

Khatab Alam
H/No.: 23, BL. No 5
PO: Kankinara
Distt: 24 Pgs (N) - 743126
Mob.: 9339966186

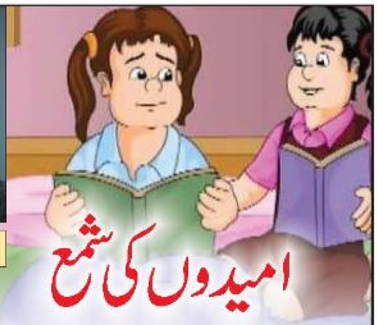

حامد حسین

امیدوں کی شمع

چراغِ محبت جلاتے رہیں ہم
زمانے سے ظلمت مٹاتے رہیں ہم

کریں کام سب اچھے اچھے ہمیشہ
برائی سے خود کو بچاتے رہیں ہم

مشقت سے محنت سے ہر کام کرکے
قدم سوئے منزل بڑھاتے رہیں ہم

ملے کوئی اندھا کہیں پر جو ہم کو
اسے راہ سیدھی دکھاتے رہیں ہم

پڑھیں اور پڑھ کر کے آگے بڑھیں ہم
وطن کی یوں عزّت بڑھاتے رہیں ہم

غریب اور بے کس کا بن کر سہارا
ہر اک بوجھ ان کا اٹھاتے رہیں ہم

نہ بیٹھیں کبھی ہوکے مایوس ہرگز
امیدوں کی شمع جلاتے رہیں ہم

■

Hamid Husain Bin Gayasuddin
Dumaria, Bisstaria, Rani Ganj
Araria- 854334 (Bihar)
Mob.: 9570530961

کہانی

آزادی

محمد سراج عظیم

محمد سراج عظیم کا تعلق بریلی اتر پردیش سے ہے۔ انھوں نے بی ایس سی اور ایم اے اردو کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ بچوں کے لیے 1978 سے انھوں نے لکھنا شروع کیا۔ اب تک ان کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ 'دادا بیتی' جو میری پہچان گئی۔ شیطان کی دوکان، دنیا کے ممالک کی لوک کہانیاں، دنیا کے رنگ ہزار (حسین حسان مدیر :پیام تعلیم کی چار کتابوں کی ترتیب و تدوین) انھیں مختلف اکادمیوں اور اداروں سے ایوارڈ مل چکے ہیں۔ انھوں نے ادب اطفال کے فروغ کے لیے آل انڈیا ادب اطفال سوسائٹی کی تشکیل کی ہے جس کے بینر تلے ادب اطفال پر نیشنل، انٹرنیشنل سمینار اور ورکشاپ منعقد ہو چکے ہیں۔

میں اسکول میں تھی کہ میرے بیٹے کا فون آیا۔ ''ممی آپ کہاں ہیں۔ کب تک گھر آئیں گی۔''

''کیوں کیا بات ہے؟ رَشّو تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔'' میں نے گھبرا کر پوچھا:

''ارے ممی آیئے تو جلدی'' رشّو نے یہ کہہ کر فون کاٹ دیا۔ میں بہت زیادہ بے چین ہوگئی۔ میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ میرے اسکول کی چھٹی ہوگئی تھی لیکن آج پرنسپل نے میٹنگ بلائی تھی جس کی وجہ سے دیر ہوگئی ورنہ اس وقت میں گھر پر ہوتی۔ میں نے پرنسپل کو رَشّو کے فون کا بتا کر اجازت لی اور فوراً آٹو سے گھر پہنچی۔

''رَشّو رَشّو!! کہاں ہو؟ کیا بات ہے بیٹا؟'' گھر میں گھستے ہی میں نے اپنے بیٹے کو آوازیں لگائیں۔ وہ کمرے سے نکل کر بھاگتا ہوا آیا۔

''کیا ہوا ممی؟ کیوں چیخ رہی ہیں'' اس نے پوچھا۔

''ارے تم نے ہی تو مجھے فون پر کہا تھا جلدی گھر آنے کے لیے۔ تمھیں معلوم ہے میرا کیا حال ہوا ہے۔ کس مشکل سے گھر پہنچی ہوں۔ کیا ہوا تم نے اتنے گھبرا کر فون کیوں کیا

تھا‘‘ میں نے غصے اور عجلت میں کہا۔ اتنی دیر میں میری بیٹی نافعہ جس کو سب لوگ نفّو کہتے تھے وہ بھی آ گئی۔

’’کیا ممی آپ تو ہر بات پر گھبرا جاتی ہیں، کچھ نہیں آپ کمرے میں آیئے‘‘ یہ کہتے ہوئے رشّو کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ ساتھ میں نفّو بھی آئی۔

’’دیکھیے ممی یہ کیا ہے‘‘ اس نے ایک جوتے کے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

’’کیا ہے؟‘‘ میں نے جھک کر ڈبے میں دیکھا۔ اس میں دو کالے کالے چھوٹے بچے تھے۔‘‘ ارے یہ کس کے بچے ہیں؟ رشّو تم کیا کرتے رہتے ہو کہاں سے اٹھا کر لائے ہو ان بچوں کو‘‘ میں نے غصے میں رشّو کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

’’ارے ممی یہ طوطے کے بچے ہیں۔ میں اور نفّو ابھی پارک میں گئے تھے تو وہاں ہم نے دیکھا ایک چیل نے ان کے گھونسلے میں جھپٹا مارا اور ایک بچہ اپنے پیروں میں دبا کر اڑ گئی۔ جو طوطی تھی وہ بھی اڑ کر پتہ نہیں کہاں چلی گئی۔ یہ دونوں بچے نیچے گر گئے ممی مجھے ان بچوں پر ترس آیا میں ان کو اٹھا کر گھر لے آیا‘‘ رشّو نے پوری تفصیل بتائی۔ میں خاموش ہو گئی۔ لیکن اندر اندر فکر مند ہو گئی کہ یہ ایک دو دن کے بچے کیسے پلیں گے؟ یہ بھوکے پیاسے رہیں گے تو مر جائیں گے اور گناہ ہمارے سر آئے گا۔

’’تم ان بچوں کو اٹھا کر لے آئے ان کو کیسے کھلائے پلائیں گے بھوکے پیاسے مر گئے تو گناہ الگ ہوگا‘‘ میں نے دونوں بچوں سے کہا۔

’’ممی! ہم ان کو چھوڑ آتے تب بھی مر جاتے تب بھی تو گناہ ہوتا‘‘ نفّو نے فوراً جواب دیا۔ میں لاجواب تھی۔

طوطے کے بچے بہت کمزور آواز میں چیں چیں کر رہے تھے اور بار بار چونچ کھول رہے تھے۔ مجھے انھیں دیکھ کر بڑا ترس آ رہا تھا۔ اب کیا کروں دسمبر کی سردی تھی میرا گھر بڑا سا تھا۔ یہ میرے سسر نے بنوایا تھا۔ سامنے صدر دروازہ اس کے بعد بڑا سا آنگن اس کے بعد ورانڈہ جو پورا جالی سے کور تھا اور پردے پڑے ہوئے تھے، بڑا سا ہال نما کمرہ جہاں جوتے کے ڈبے میں بڑے سے پلنگ کے نیچے بچے تھے۔ سردی بہت تھی میں نے جلدی سے کاٹن کے رول سے روئی کا بڑا سا ٹکڑا لیا اور ڈبے میں بچھا دیا اور بچوں کو اس پر رکھ دیا اور ڈبے کے ڈھکنے میں چار پانچ چھوٹے چھوٹے سوراخ کر دیے تاکہ اس میں سے تھوڑی روشنی اور ہوا ڈبہ میں آتی رہے۔

بچے برابر چیں چیں کیے جا رہے تھے وہ شاید اپنی ماں کے لیے رو رہے تھے اور بھوکے بھی تھے۔ میں نے باورچی خانہ میں جا کر تلاش کیا اور پکے ہوئے چاول کے کچھ دانے ایک پیالی میں لے آئی اب انھیں کھلاؤں کیسے بچے بہت چھوٹے تھے وہ خود اپنی چونچ سے کھا نہیں سکتے تھے۔ میں نے رشّو سے کہا بیٹا فرسٹ ایڈ باکس میں رکھی چمٹی لے آؤ جب رشّو وہ لے آیا تو میں نے نفّو سے کان میں دوا ڈالنے والا ڈراپر منگایا۔ میں نے چمٹی سے ایک ایک دانہ بچوں کی چونچ میں ڈالنا شروع کیا اور ڈراپر سے ایک ایک بوند پانی دیا۔ بچوں نے دانے کھائے اور پانی کی بوندیں جب ان کے پیٹ میں گئیں تو خاموش ہو گئے۔ اب میری ذمے داریوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔

میں روز بچوں کی دیکھ بھال کرتی۔ رشّو اور نفّو بھی بچوں کا بڑا خیال رکھتے۔ روز روئی بدلتے جو گندی ہو جاتی تھی۔ بچے دھیرے دھیرے بڑے ہونے لگے، دن گزرتے رہے بچوں کے پر پہلے ہلکے پیلے پھر ہرے ہونے لگے۔ اسی طرح پیلی چونچ لال ہونے لگی۔ بدشکل اور بھدے بچے اب اپنی

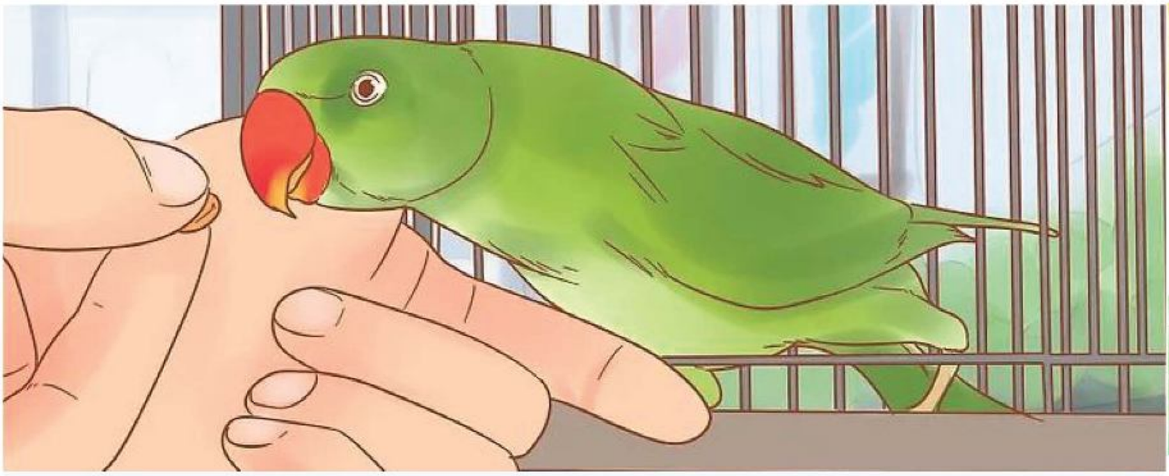

رنگت بدل رہے تھے۔ وہ اچھے لگنے لگے تھے۔ دونوں بچے رشاد اور نافعہ بھی ان بچوں کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے۔ طوطے کے بچوں کا جوتے کے ڈبے سے بڑا ڈبہ ہوگیا تھا۔

مارچ شروع ہوگیا تھا سردی کم ہونے لگی تھی۔ اب طوطے کے بچے اچھے بڑے ہوگئے تھے۔ وہ کھلے میں رہنے لگے تھے۔ دن میں پورے کمرے میں ٹہلا کرتے۔ رات میں رَشّو یا نافعہ ان کو ڈبہ میں بند کردیتے۔ بچے بہت خوبصورت طوطے ہوگئے تھے۔ سب سے بڑی بات وہ طوطوں کی طرح ٹائیں ٹائیں کرنے لگے تھے۔ جس دن پہلی بار ان بچوں نے طوطوں کی طرح بولنا شروع کیا تھا رشاد اور نافعہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ رَشّو فوراً دوڑے دوڑے میرے پاس آئے، چیختے ہوئے بولے۔ ممّی مٹھو بیٹے بولنے لگے۔ ممی اب میں مٹھو بیٹے کو بولنا سکھاؤں گا۔ مجھے بتایئے ان کو کیا سکھاؤں۔ مجھے اپنی امّی یاد آگئیں ہمارے گھر میں بھی طوطا پلا ہوا تھا امی صبح فجر کی نماز پڑھ کر مٹھو کو ہری مرچ دیتیں اور کہتیں ''مٹھو بیٹے نبی جی، کو بھیجو'' میں نے رشاد سے کہا ''بیٹا طوطا بڑا سیکھنے والا ہوتا ہے تم اس کے سامنے جو بولو گے وہ سیکھ لے گا'' ''سچی ممی!'' رشو خوش ہوگئے۔ اب دونوں بچے طوطوں کو باتیں سکھانے لگے ''مٹھو بیٹے۔ سلام علیکم!'' ''مٹھو بیٹے! بولو خدا حافظ'' دونوں بچے دن بھر طوطوں کو کچھ نہ کچھ سکھانے کی کوشش کرتے۔ ایک دن جیسے ہی طوطے ڈبے سے باہر آئے رشاد بولتے اس سے پہلے طوطے نے کہا ''سلام علیکم'' ''ارے ممی! مٹھو بیٹا سلام کر رہا ہے۔'' رشو کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ نافعہ بھی بہت خوش تھیں۔ اب طوطے ہر آنے جانے والے کو سلام اور خدا حافظ کرتے۔ سمجھدار طوطے تھے کوئی آتا تو بہت زور سے سلام کرتے اور کوئی گھر سے جاتا تو خدا حافظ کرتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بچے اور میں اسکول جاتے وقت خدا حافظ کہتے اور اسکول سے واپس آتے تو سلام کرتے۔

ایک طوطا جو بڑا تھا وہ کبھی رَشّو کی گود میں تو کبھی نَفّو کی گود میں بیٹھتا۔ دونوں بچے طوطوں سے تمام جہان کی باتیں کرتے۔ صبح کے وقت سب لوگ ٹیبل پر ناشتہ کرتے تو طوطے آس پاس ٹہلتے رہتے۔ جیسے رشّو اور نَفّو کہتے ''ممی! ناشتہ دیجیے۔ بسکٹ دیجیے'' ویسے ہی طوطے کہتے ''ممی بسکٹ دیجیے'' بچے ان کو بسکٹ دیتے تو آدھا کھاتے آدھا زمین پر بکھیرتے۔ ایک دن بڑا طوطا بسکٹ کھا کر پر پھیلانے لگا اور ایک جست لگائی اور کمرے میں اڑنے لگا ''ارے ارے! ممی! مٹھو بیٹا اڑنے لگا'' رشو خوش ہوکر چلا رہے تھے۔ اس کے بعد سے وہ طوطا صبح ناشتہ کے بعد کمرے اور ورانڈے میں اڑنے لگا۔ چھت کا پنکھا چلتا

ہوتا تو اس کی وجہ سے بند کرنا پڑتا۔ شکر یہ تھا کہ ورانڈے کا جالی کا دروازہ بند رہتا تھا۔ اس لیے طوطا ورانڈے اور ہال میں ہی چکر کاٹتا رہتا۔ ایک دن رَشّو کے پاپا کے پاس کوئی ملنے آیا وہ بے خیالی میں ورانڈے کا دروازہ کھلا چھوڑ گئے۔ مٹھو اڑا اور ورانڈے سے باہر نکل گیا اور آنگن کی دیوار کی منڈھیر پر بیٹھ گیا۔ نقّو اور رَشّو دونوں چیخے ممی مٹھو بیٹا باہر اڑ گیا۔ میں بھاگتی ہوئی آنگن میں پہنچی مگر دوسرے طوطے کی وجہ سے ورانڈے کا دروازہ بند کرتی ہوئی آئی۔ مٹھو منڈھیر پر بیٹھا ہوا سلام علیکم کر رہا تھا۔ رَشّو اور نقّو ایک دم بے چین نظر آرہے تھے'' ممی مٹھو بیٹا کیا اڑ جائے گا ممی اب کیا ہوگا؟ مٹھو بیٹا آجاؤ بسکٹ کھاؤ گے'' رَشّو نقّو دونوں بڑی بے یقینی میں باری باری مٹھو کو بلا رہے تھے۔ طوطا طوطا ہوتا ہے۔ مٹھو نے رَشّو اور نقّو کے جواب میں ''خدا حافظ'' کہا اور منڈھیر پر اپنے پر پھیلائے اور ٹیں ٹیں کرتے ہوئے اڑ گیا اور آسمان کی بلندیوں میں گم ہو گیا۔ ''ممی! مٹھو بیٹا اڑ گیا! ممی اب مٹھو بیٹا نہیں آئے گا کیا؟'' رَشّو روہانسوں ہو کر کہہ رہے تھے۔ نقّو باقاعدہ بڑے بڑے آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔

مٹھو کے اڑ جانے پر بچے کئی دن تک افسردہ رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دوسرے طوطے کی بڑی دیکھ بھال کرتے۔ دونوں بہن بھائی اس بات کا دھیان رکھتے کہ ورانڈے کا دروازہ کھلا نہ رہ جائے۔ کچھ دنوں کے بعد دوسرا طوطا بھی اڑنا سیکھ گیا اب وہ بھی ہال اور ورانڈے میں چکر کاٹتا۔ رَشّو اور نقّو سہمے ہوئے طوطے کو اڑتا دیکھتے رہتے۔ بولتے کچھ نہیں تھے۔ طوطا اڑتے اڑتے ٹیبل پر آکر بیٹھ جاتا۔ بولتا ''مٹھو بیٹے نبی جی کو بھیجو'' رَشّو خوش ہو جاتے اور اس کو پنجرے میں بند کر دیتے۔

دن گزرتے گئے مٹھو بہت بڑا اور تندرست ہو گیا تھا۔ خوبصورت بھی لگنے لگا تھا۔ رشّو اور نقّو کا نام بھی لینے لگا تھا۔ جب وہ کہتا ''رَ... شو... و... نبی... جی.... کو... بھیجو...'' تو رشو بہت خوش ہو جاتے۔ ''ہاں مٹھو بیٹے بسکٹ کھاؤ گے'' اب سب پہلے طوطے کو بھول چکے تھے۔ برسات شروع ہو گئی تھی اس طرف ہریالی چھائی ہوئی تھی۔ اگست کا مہینہ تھا۔ پندرہ اگست آزادی کا دن تھا۔ ٹی وی پر پریڈ کا ٹیلی کاسٹ ہو رہا تھا۔ طوطا کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ میں ورانڈے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ پیچھے پیچھے طوطا آ گیا۔ مجھے پتہ نہیں چلا۔ لیکن رَشّو نے دیکھ لیا تھا۔ وہ چیخا ممی ممی مٹھو باہر نکل گیا۔ میں پیچھے مڑ کر دیکھتی مگر دیر ہو چکی تھی۔ طوطا اڑا اور منڈھیر پر بیٹھ گیا۔ اس نے پر پھڑ پھڑائے اور اڑ گیا۔ مگر اڑ کر پھر منڈھیر پر آکر بیٹھ گیا۔ میری اور دونوں بچوں کی جان میں جان آئی۔ میں سمجھی یہ دوبارہ واپس آگیا اب کہیں نہیں جائے گا۔ رَشّو خوش ہو کر بولے ''ممی مٹھو بیٹا آ گیا۔ آؤ مٹھو بیٹے آؤ بسکٹ کھاؤ گے'' مٹھو نے اپنی رٹ میں کہا ''رَشّو!! سلام علیکم!! خدا حافظ'' اور آسمان میں یہ جا وہ جا۔

رَشّو رو رہے تھے۔ ''ممی مٹھو بیٹا اب کبھی نہیں آئے گا!! امّی بتایئے مٹھو کو ہم سے محبت نہیں تھی'' رشو اور نقّو رو رہے تھے۔ مجھے بھی افسوس تھا مگر میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا ''بیٹا آج پندرہ اگست ہے۔ ہم سب کو آج کے دن آزادی ملی تھی۔ مٹھو کو بھی آزادی چاہیے تھی۔ اسی لیے وہ اڑ گیا'' ''مگر ممی کیوں ہم نے تو اس کو بہت اچھے سے پالا تھا'' میرے پاس رَشّو کے معصوم سوال کا جواب نہیں تھا۔

■

Mohd Siraj Azeem
A-47, Zakir Bagh
Okhla Road, Jamia Nagar
New Delhi - 110025

لوٹ کے بدھو گھر کو آئے

کسی گاؤں میں ایک غریب لڑکا تھا۔ وہ پڑھنے لکھنے میں بہت تیز تھا۔ دیکھنے میں بھی خوبصورت۔ لیکن اپنے بچپن میں سے وہ چست چالاک نہیں تھا یا کسی اور وجہ سے اس کے ماں باپ نے اس کا نام بدھو رکھ دیا تھا۔ جیسا کہ ہوتا ہے بچے کو پڑھنے لکھنے کے لیے گاؤں سے شہر میں بھیج دیا جاتا ہے۔ تاکہ شہر میں اچھی تعلیم حاصل کرے۔ پڑھ لکھ کر بچہ کچھ بن جائے۔ اس لیے بدھورام کو بھی پڑھائی لکھائی کے لیے اس کے ماں باپ نے شہر بھیج دیا تھا۔

بدھورام شہر میں پڑھ لکھ کر بہت ہوشیار ہوگیا۔ اچھی تعلیم حاصل کرنے کے بعد تو اس کی شخصیت میں اور نکھار آ گئی۔ سمجھدار بھی کافی ہوگیا۔ اس لئے وہ جہاں جاتا اپنا سکّہ جما لیتا۔ جب اس کی پڑھائی لکھائی ختم ہوگئی تو اسے نوکری مل گئی۔ پیسے بھی کافی کمائے۔ پھر اسے اچانک اپنے وطن کا خیال آیا اپنا گاؤں یاد آنے لگا۔ اس لیے اس نے سوچا چلو اپنے گاؤں میں جا کر رہا جائے۔ وہاں سارے اپنے لوگ اپنے پڑوسی، رشتے دار ہیں۔ سب کے ساتھ مل جل کر رہنے میں کتنا مزہ آئے گا۔ گاؤں میں سب مجھے جانیں گے۔ سب سے اپنے پن کا برتاؤ ملے گا۔ لوگوں

صدر عالم گوہر

صدر عالم گوہر کا تعلق پرسولیا، ضلع مدھوبنی بہار سے ہے۔ انھوں نے اردو سے ایم اے کیا ہے۔ وہ کئی زبانیں جانتے ہیں جن میں عربی، اردو کے علاوہ میتھلی، گجراتی، نیپالی بھی شامل ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے اردو، ہندی اور میتھلی میں شائع ہوچکے ہیں۔ بچوں کے لیے انھوں نے 'گونوجھا کے قصے اور دوسری کہانیاں' کے عنوان سے کتاب لکھی ہے جس پر انھیں مہاراشٹر اور بہار اردو اکادمی سے ایوارڈ بھی ملا ہے۔ بچوں کے لیے ان کی کہانیاں امنگ، الہلال اور بچوں کی دنیا میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ صدر عالم گوہر کو مختلف اعزازات مل چکے ہیں جن میں ساہتیہ اکادمی ایوارڈ برائے ترجمہ قابل ذکر ہے۔

اس مسئلے کا حل کیا ہو سکتا ہے۔ اپنے نام کو بدلا کیسا جائے۔ اس 'بدھو'نام سے چھٹکارا کیسے حاصل کریں۔ آخر سوچتے سوچتے ایک حل نکلا۔ بدھورام نے سوچا کہ بھلا یہ گاؤں ہی کیوں نہ چھوڑ دیا جائے۔ اور کسی ایسی جگہ بس جایا جائے جہاں لوگ میرے نام یعنی''بدھورام'' کو نہ جانتے ہوں۔ وہاں جا کر کوئی نیا اچھا سا نام رکھ لوں گا۔ اور پھر اسی نام سے پکارا جاؤں گا۔ بس یہی سوچ کر اس نے اپنا گاؤں چھوڑ دیا۔

جاتے جاتے جب وہ اپنے گاؤں سے بہت دور نکل گیا تو وہ تھک گیا۔ اس لیے وہ ایک پیپل کے درخت کے نیچے تھوڑا آرام کرنے کے لیے رک گیا۔ اس درخت کے نیچے ایک آدمی اس سے پہلے سے بیٹھا تھا۔ اس کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے تھے۔ نہایت خستہ حال تھا۔ کوئی بھکاری معلوم ہو رہا تھا۔ بدھو رام کو اس پر رحم آ گیا۔ اتفاق سے ''بدھورام'' نے اس آدمی سے پوچھا ''بھائی آپ کا نام کیا ہے؟'' اس آدمی نے کہا ''دولت رام''۔ بدھورام کو زور کی ہنسی آ گئی لیکن اس نے ہنسی کو روک لیا۔ تا کہ ''دولت رام'' کو برا نہ لگے۔ اور پھر وہاں سے اٹھ کر آگے چلا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد اسے پیاس لگی۔ سامنے ایک آدمی پر نظر پڑی۔ وہ آدمی اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر کی مرمت کر رہا تھا۔ اس سے کہا کہ بھائی مجھے تھوڑا پانی پلا دو۔ وہ آدمی کام چھوڑ کر اپنے آنگن میں گیا اور ایک لوٹے میں پانی لے کر آیا اور اس کو پینے کو دیا۔ پانی پی کر بدھورام کی جب پیاس بجھ گئی تو اس نے اس آدمی سے پوچھا، بھائی صاحب آپ کا نام کیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا۔''اشرفی لال''۔ بدھورام آگے بڑھا۔ آگے ایک جنازہ جا رہا تھا جس میں بہت سے لوگ شامل تھے۔ جنازے میں شامل ہونے والے لوگوں کی لمبی قطار دیکھ کر بدھورام نے اندازہ لگایا کہ یہ جنازہ ضرور کسی امیر کبیر شخص کا ہوگا۔ عام آدمی کے جنازے میں اتنے سارے لوگ کہاں شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کے دل میں جستجو پیدا ہوئی کہ ذرا معلوم کیا جائے کہ یہ کس بڑے آدمی کا جنازہ ہے۔ آخر کار بدھورام نے جنازے میں شامل ایک آدمی سے پوچھ ہی لیا۔ یہ کس امیر کبیر شخص کا جنازہ ہے۔ مرنے والے کا نام کیا ہے تو اس آدمی نے جواب دیا''امر ساہو''۔ یہاں یہ بتا تا چلوں کہ ''امر''لفظ کے معنی ہوتے ہیں ''نہیں مرنے والا''۔

بدھورام کے قدم یہ سنتے ہی رک گئے۔ اس کے دل میں ایک طوفان اٹھ گیا۔ ایک اتھل پتھل مچ گئی اس کے ذہن میں۔ وہ سوچنے لگا۔ ''امر ساہو'' مر گئے۔ ''اشرفی لال'' اپنے ٹوٹے پھوٹے گھر کی مرمت کر رہے تھے۔ ''دولت رام'' کے بدن پر پھٹے پرانے، بھکاری جیسے کپڑے تھے، یہی تو ہے نام کی اہمیت اور میں اسی کے چکّر میں پھنس کر اپنے پرائے، رشتے دار، دوست، احباب اور سماج کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ میرے جیسا بیوقوف کون ہوگا؟ بلا وجہ عالم، فاضل، عقلمند ہونے کے وہم میں مبتلا ہوں..........۔

یہی سوچتے ہوئے بدھورام اپنے گاؤں واپس آ گیا۔ شاید اسی وجہ سے یہ کہاوت مشہور ہے کہ لوٹ کے بدھو گھر کو آئے۔

دوسرے روز صبح کو بدھورام کے دوست احباب، ملنے جلنے والے جن لوگوں کو اس کے گاؤں چھوڑ کے جانے کی وجہ معلوم تھی، ان لوگوں نے واپس لوٹ آنے کی وجہ پوچھی تو بدھورام نے سب کو ایک ہی جواب دیا۔

امر ساہو کو مرتے دیکھا
اشرفی کا ٹوٹا گھر بار
دولت رام پہنے پھٹا پرانا
بدھو نام ہی ٹھیک ہے یار

■

Sadre Alam Gauhar
Village & Post: Parsolia
Distt.: Madhubani - 847226
Mob.: 7715980144

اڑتا سکھ

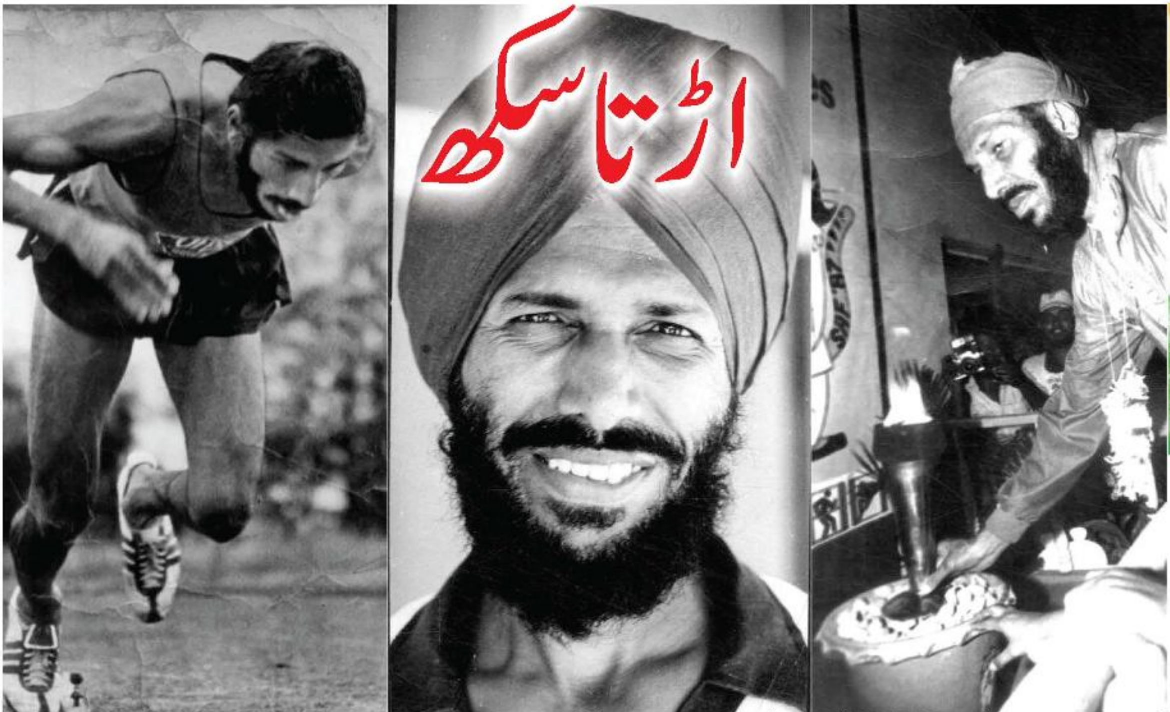

خان حسنین عاقب

خان حسنین عاقب کا تعلق اکولہ مہاراشٹر سے ہے۔ وہ جی این آزاد کالج پوسد میں لیکچرر ہیں۔ بچوں کے بھی ادیب و شاعر ہیں۔ انھوں نے شفیع الدین نیر کی کہانیوں کا کلیات اور ان کی نظموں کا کلیات مرتب کیا ہے۔ بچوں کے لیے ان کی کہانیوں کا مجموعہ ’آسماں کم ہے‘ اور نظموں کا مجموعہ ’فرشتوں کے لیے‘ بالترتیب زیر اشاعت اور زیر ترتیب ہیں۔ درسی کتابیں تیار کرنے والے ادارے بال بھارتی کی اردو اور فارسی لسانی کمیٹی کے رکن ہیں۔ انھیں ریاست مہاراشٹر کی اردو ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ریاستی مثالی معلم کا ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

عام طور سے ذہین بچے اپنے ماں باپ سے یا اپنے اساتذہ سے روز کچھ نہ کچھ سوالات کرتے ہی رہتے ہیں۔

ہمارے بچے بھی ایسے ہی ہیں۔ سوال کیسا ہی ہو، اگر ان کے دماغ میں اُلجھن پیدا ہوگئی، تو بس، مت پوچھیے، کیسی جلدی ہوتی ہے انھیں اپنے سوالات کے اطمینان بخش جواب حاصل کرنے کی! فرمان میاں، ام عمارہ اور عدنان، تینوں بھی ایسے ہی ہیں۔ جب سوال کرتے ہیں، تو پھر، بس، سوال ہی کرتے ہیں۔

رات ہی کی بات لیجیے۔ کہنے لگے۔ ’ابو! ذرا دیکھیے تو، ٹی۔ وی کے کسی چینل پر ایک فلم کا اشتہار آرہا ہے۔ فلم کا نام عجیب وغریب ہے۔ ’بھاگ ملکھا بھاگ‘۔ اب یہ بھی کوئی نام ہے بھلا؟ ابو، آپ ہی بتایئے، کہ اس فلم کا نام اتنا عجیب و غریب کیوں ہے؟‘

ہم کو ہنسی تو آنی ہی تھی۔ کیوں کہ وہ فلم ہندوستانی کھیلوں کی دنیا کی ایک نہایت اہم اور مشہور ہستی کی زندگی پر بنی ہوئی

تھی۔ ہم نے کہا، ’اچھا بھائی، چلو، پہلے ہم تمھیں ایک کہانی سناتے ہیں، اس کے بعد جو کچھ بات چیت ہوگی، تمھیں سب سمجھ میں آجائے گا کہ اس فلم کا نام اتنا عجیب وغریب کیوں ہے۔‘

بچے خوش ہوکر تالیاں بجانے لگے۔ ’واہ واہ! ایک سوال پر ایک کہانی فری!‘

بچوں کا شور سن کر بچوں کی امی بھی چلی آئیں۔ وہ کھانا پکانے سے فارغ ہو چکی تھیں۔ بس، اب انتظار تھا کہ بچوں کو اور ہمیں بھی بھوک لگ جائے۔ ہم نے کہنا شروع کیا۔

’آزادی سے پہلے کے ہندوستان اور آج کے پاکستان کے علاقہ پنجاب کے ضلع مظفر گڑھ سے دس کلو میٹر دور ایک چھوٹے سے گاؤں گووند پورا کی بات ہے۔ ایک لڑکا سڑک پر دوڑتا جا رہا تھا۔ سڑک کیا تھی، بس ایک راستہ تھا جس پر لوگ چلا کرتے تھے۔

رحیم دین چاچا نے زور سے پکار کر کہا، ’’پُتّر، یہ روز روز کیا بھاگا دوڑی کرتا ہے؟‘

لڑکا ذرا ٹھہرا، رُک کر بولا، ’چاچا، میں مدرسہ جا رہا ہوں۔‘

وہ بولے، ’لیکن تیرا مدرسہ ہے کہاں؟‘ لڑکا بولا، ’میرا مدرسہ یہاں سے پانچ کلو میٹر دور ہے۔‘

چاچا حیرت میں پڑ گئے۔ بولے، ’اچھا؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا بیٹا کہ تو پانچ کلو میٹر دوڑتے ہوئے جاتا ہے اور پانچ کلو میٹر دوڑتے ہوئے واپس آتا ہے۔ کیوں، ہے نا؟‘

لڑکا بولا، ’ہاں چاچا، ایسا ہی ہے۔ میرا مدرسہ آنا جانا، کُل ملا کر دس کلو میٹر ہو جاتا ہے۔‘

وہ بولے، ’اتنی چھوٹی عمر میں، تو اتنا دوڑتا ہے تو تھک نہیں جاتا؟‘

لڑکا ہنستا ہوا بولا، ’نہیں چاچا، مجھے تو بہت مزہ آتا ہے۔ اگر مدرسہ اس سے بھی زیادہ دور ہوتا تو مجھے اور زیادہ مزہ آتا۔‘

عدنان میاں خاموش نہ رہ سکے۔ بیچ ہی میں بول پڑے۔ ’ابو، وہ لڑکا کون تھا؟ کیا آپ جانتے ہیں اُس لڑکے کو؟‘

ہم نے ہنس کر کہا، ’ہاں بھائی، ہم بھی جانتے ہیں اور اب تم بھی جان جاؤ گے۔ اس لڑکے کا نام تھا مِلکھا سنگھ۔‘

ملکھا سنگھ 1935 میں اسی گووند پورا میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ کل ملا کر پندرہ بھائی بہن تھے۔ گھر میں غریبی تھی۔ مدرسہ یعنی اسکول پانچ کلو میٹر دور تھا اور سواری سے جانے کے لئے روز روز پیسے کہاں سے آتے؟ اس لیے ننھے مِلکھا کو اپنی علم کی بھوک مٹانے کے لیے دس کلو میٹر دور جانا آنا پڑتا تھا۔ ملکھا کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ اتنا فاصلہ پیدل چل کر طے کرے۔ ملکھا نے سوچا، ’اگر میں پیدل چلنے کے بجائے دوڑ کر اسکول جایا کروں تو وقت کی بچت بھی ہو جایا کرے گی۔‘

’ارے باپ رے، ابو، اتنا سا لڑکا اور دس کلو میٹر دور روزانہ آتا جاتا تھا؟‘ اُمِ عمارہ حیرت سے بول پڑی۔

ہم نے کہا ’ہاں بیٹا، وہ زمانہ ایسا تھا کہ لوگوں کے پاس کمائی کے ذرائع کم تھے۔ اکثر لوگ بھوکے بھی رہتے تھے۔ گاڑیاں صرف امیر لوگوں یا نوابوں اور راجاؤں کے پاس ہوا کرتی تھیں۔ اب یہی اپنے یہاں دو دو موٹر سائیکلس دیکھ رہی ہو نا، یہ اس زمانے میں صرف رئیس لوگوں کے پاس ہوا کرتی تھیں۔‘

عدنان بولا، ’تو کیا ابو، ہم رئیس لوگ ہیں؟‘

عدنان کی امّی ہنستے ہوئے بولیں، ’نہیں بیٹے، ہم رئیس تو نہیں ہیں لیکن اب ایسی گاڑیاں خریدنے کے لیے رئیس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، عام لوگ بھی ایسی گاڑیاں خریدتے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں سائیکل بھی بہت کم لوگوں کے پاس ہوا کرتی تھی۔‘

پھر وہ ہم سے بولیں،' اچھا، آپ بتائیے، پھر ملکھا نے کیا کیا؟'

ہم نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا، ' پھر ملکھا نے ایسا ہی کیا۔ دس کلومیٹر روز کا یہ فاصلہ طے کرنا، اب ان کی عادت بن گئی تھی۔ انھیں دوڑے بغیر مزہ ہی نہیں آتا تھا۔ کچھ عرصے بعد، جب وہ تقریباً دس بارہ برس کے تھے، ہندوستان کی تقسیم کا واقعہ رونما ہوگیا۔ اور تقسیم کے بعد 1947 میں وہ اپنے خاندان کے ساتھ ہندوستان چلے آئے۔ یہاں آکر وہ دہلی میں رہنے لگے۔ نیا ملک، نیا شہر، ضروریاتِ زندگی، مخالف حالات، ان سب کی وجہ سے ملکھا سنگھ پریشان رہتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے سوچا،' کیوں نہ میں ڈاکو بن جاؤں؟ پیسہ بھی خوب حاصل ہوگا اور لوگ بھی مجھ سے ڈریں گے بھی۔'

لیکن پھر اپنے اس خیال کو انھوں نے یہ سوچتے ہوئے رد کردیا کہ ڈاکو بن کر پیسے تو مل جائیں گے اور لوگ ڈریں گے بھی لیکن عزت کے بجائے نفرت کریں گے۔'

' ارے باپ رے، ابو، جو ڈاکو بننے کا سوچ رہا ہو، وہ دیش کی عزت کیسے بن گیا'؟ امِ عمارہ حیرت سے بول پڑی۔

' ہاں بیٹے، ایسا ہوتا ہے۔ اکثر مایوسی کے عالم میں ایسے خیالات ذہن میں آ ہی جاتے ہیں۔ یہ بری بات نہیں ہے کیونکہ خیالات کو آنے سے روکنا ہمارے بس میں نہیں ہوتا۔ لیکن ان خیالات کو نکال پھینکنا اور ہمت کرکے اس حالت سے نکلنے کی کوشش کرنے سے آدمی بڑا بنتا ہے۔ سمجھیں؟' ہم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

' ہاں، ابو، ہم سمجھ گئے، اب آپ آگے کی کہانی سُنایئے۔'

اب کی دفعہ فرمان کی بے تابی عروج پر تھی۔

ہم نے کہنا شروع کیا۔' تو بھائی، دہلی میں ملکھا سنگھ ایک مختصر عرصے کے لیے اپنی شادی شدہ بہن کے گھر رہنے لگے۔ ایک دن وہ ریل میں سفر کررہے تھے۔ جیب میں ٹکٹ کے لئے پیسے نہیں تھے اور منزل بہت دور تھی۔ وہ دوڑ کر وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس لیے انھوں نے بغیر ٹکٹ ریل میں سفر کیا۔ قسمت کی خرابی دیکھیے کہ ریل میں ٹکٹ چیکر آ گیا۔ ملکھا سنگھ پکڑے گئے۔ جرمانہ لگایا گیا جسے وہ ادا نہیں کر پائے اور نتیجے میں انھیں تہاڑ جیل میں بھیج دیا گیا۔ ان کی بہن، جن کا نام ایشور تھا، ان سے اپنے بھائی کو جیل میں دیکھا نہیں گیا۔ انھوں نے اپنے کچھ زیورات بیچ کر اپنے بھائی کو جیل سے چھڑایا۔'

یہ واقعہ سن کر فرمان کو جیسے موقع مل گیا۔ وہ بول پڑا۔ ' دیکھا امِ عمارہ، کیسی بہن تھی۔ اپنے بھائی کے لیے اپنے زیورات تک بیچ ڈالے۔ اور ایک تم ہو کہ اپنے بڑے بھائی کو نہ ہی کھانے کی کوئی چیز دیتی ہو اور ہمیشہ لڑتی رہتی ہو۔'

ادھر امِ عمارہ کب پیچھے رہتی۔ چمک کر بولنے لگی۔ ' دیکھیے ابو، بھائی جان بھی تو مجھ سے پیار سے بات نہیں کرتے۔ ہمیشہ مجھ سے لڑائی پر آمادہ رہتے ہیں۔'

اس سے پہلے کہ پھر لڑائی شروع ہوجاتی، ہم نے مسکرا کر کہا،' اچھا بھائی، یہ فیصلہ ہم بعد میں کرلیں گے کہ کون کیسا ہے۔ پہلے کہانی سن لو۔ تو جناب، اسی دوران ان کے ایک بھائی، مِلکھان سنگھ، ہندوستانی فوج میں بھرتی ہوگئے۔ انھوں نے بے روزگار مِلکھا سنگھ کو مجبور کیا کہ وہ بھی ہندوستانی فوج میں بھرتی ہوجائیں۔ یہیں سے ملکھا سنگھ کی قسمت جاگی۔ وہ فوج میں بھرتی ہوگئے۔ نئے بھرتی ہونے والے فوجیوں کے لیے مقابلے کی دوڑ میں حصہ لینا لازمی تھا۔ اس دوڑ میں اول دس مقام حاصل کرنے والے کھلاڑیوں کو مقابلے کے اگلے راؤنڈ کے لیے منتخب کیا جانا تھا اور دوڑنے کے معاملے میں ملکھا کب پیچھے رہنے والے تھے؟ انھیں تو بچپن ہی سے دس کلومیٹر روز دوڑنے کی عادت تھی۔ انھوں نے بھرتی ہونے

والے تمام فوجیوں کے ساتھ دوڑتے ہوئے چھٹا مقام حاصل کیا، جو ایک بہت بڑی اور اہم بات تھی۔ وہ تو اول مقام حاصل کرنے والے تھے لیکن افسوس کہ مقابلے کے دوران ہی ان کے پیٹ میں تیز درد اٹھا۔ اس کے باوجود وہ رک رک کر دوڑتے رہے اور چھٹا مقام حاصل کیا ورنہ وہ تو اول مقام کے حقدار تھے۔ یہیں سے انھیں اتھلیٹکس کا تعارف ہوا۔ ان کے افسروں کو بھی جلد معلوم ہو گیا کہ وہ بہترین دوڑنے والے یعنی رَنر ہیں۔ اس کے بعد ملکھا سنگھ نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ انھوں نے 1958 اور 1962 کے ایشین گیمس میں گولڈ میڈلس حاصل کیے۔ انھوں نے 1956 اولمپکس (ملبورن، آسٹریلیا) 1960 اولمپکس (روم، اٹلی) اور 1964 اولمپکس (ٹوکیو، جاپان) میں ہندوستان کی نمائندگی کی یعنی ہندوستان کی جانب سے ان تمام اولمپکس مقابلوں میں حصہ لیا۔ انھوں نے 1958 میں دولت مشترکہ کھیلوں (کامن ویلتھ گیمس) میں انفرادی طور پر گولڈ میڈل حاصل کیا، وہ آزاد ہندوستان کی جانب سے ایک ریکارڈ تھا جو آئندہ چالیس برسوں تک ہندوستان کا کوئی کھلاڑی توڑ نہیں پایا۔ چونکہ ہر ریکارڈ توڑے جانے کے لیے بنتا ہے اس لیے آخر کار، 2014 کے دولت مشترکہ کھیلوں میں یہ ریکارڈ گولہ پھینک یعنی ڈسکس تھرو میں وِکاس گوڑا نے توڑا لیکن ملکھا سنگھ کے اپنے ریکارڈ کے ٹوٹنے کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ انھیں فخر ہے کہ کسی ہندوستانی نے اپنے ملک کے لیے ان سے بھی بہتر کارکردگی دکھائی ہے۔ ملکھا سنگھ کو ان کی تیز رفتار دوڑنے کی وجہ سے دنیا بھر میں 'فلائنگ سکھ' یعنی اڑتا سکھ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ سمجھے اب کہ یہ 'بھاگ ملکھا بھاگ' فلم کس کی زندگی پر بنائی گئی ہے؟'

'ہاں ابو، اور ہم اکثر سمجھتے تھے کہ فلائنگ سکھ شاید کسی ہوائی جہاز یا ہیلی کاپٹر کا نام ہے۔ اب ہمیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ فلائنگ سکھ یعنی اڑتا سکھ، ملکھا سنگھ کی تیز دوڑنے کی رفتار کی وجہ سے کہا جاتا ہے۔' فرمان بول اُٹھا۔

آخری یعنی اختتامی جملہ بولنے کی باری بچوں کی امی کی تھی۔ وہ بولیں۔ 'ہاں بھائی، چلو، آج تمھارے ابو نے پھر ہم سب کی معلومات میں بڑے دلچسپ انداز میں اضافہ کیا۔ ان کا شکریہ ادا کرو بھائی۔ اور چلو، اب بھوک بھی لگ چکی ہوگی، آؤ، کھانا کھائیں، اس سے پہلے کہ کھانا بالکل ٹھنڈا ہو جائے۔'

اور سب لوگ ہنستے ہوئے کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

■

Khan Hasnain Aqib
Allama Iqbal Teachers Colony
Mominpura, Washim
Pusad - 445215 (Maharashtra)
Mob.: 9423541874

خطا میری تھی

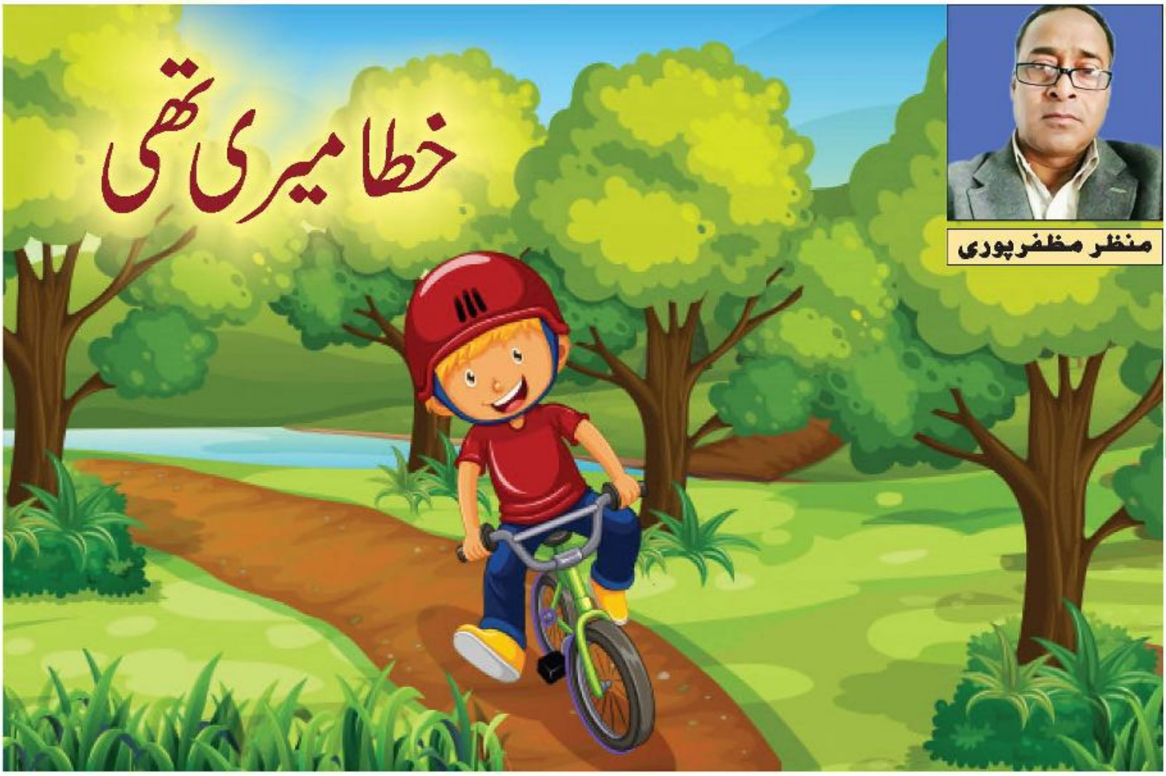

منظر مظفرپوری

میں بچپن میں خودکو ضرورت سے زیادہ تیز سمجھتا تھا اور سائیکل بھی تیز چلاتا تھا۔ جس کی وجہ سے اکثر کسی نہ کسی کو ٹھوکر ماردیتا تھا یا توازن کھوکر گر پڑتا تھا۔

ایک روز میرے ساتھ یہ ہوا کہ ٹیوشن پڑھ کر گھر لوٹنے کے دوران اوبڑ کھابڑ سڑک پر غلط طریقے سے سائیکل چلانے کے نتیجے میں سائیکل کا فریم ٹوٹ گیا اور میں لہراتے ہوئے زمین پر گر پڑا۔ لیکن اللہ کا کرم ہوا کہ مجھے معمولی طور پر اندرونی چوٹ آئی، یعنی میں بچ گیا۔ البتہ گھر پہنچنے کے بعد چچا جان سے میرا بچ پانا مشکل تھا۔ گھر کے دوسرے بچوں کے علاوہ چچا جان میرے بھی عادات و اطوار پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ ہاں! ابو نرم مزاج اور اعتدال پسند انسان تھے اور دوسرے شہر میں ملازمت کرتے تھے۔ چھٹیاں بتانے جب وہ گھر آتے، تو ہماری چھوٹی چھوٹی حرکتوں پر خاص توجہ نہیں دیتے تھے۔

سوچتا رہا کہ جب میں اپنی ٹوٹی ہوئی سائیکل کو کسی طرح ڈھوتے ہوئے گھر پہنچوں گا تو چچا جان کی عدالت میں کیا صفائی پیش کروں گا؟ جھوٹ سچ کا سہارا لے کر امی اور گھر کے دوسرے لوگوں کے اعتماد کو تو آسانی سے بحال کرلوں گا کہ کسی موٹر بائک سوار نے ٹھوکر ماردی۔

لیکن چچا جان کے سامنے اپنی غلطی پر کس طرح پردہ ڈال سکوں گا؟ .... انھیں تو بعض اوقات میری سچائی پر بھی یقین نہیں آتا۔ پھر میرے سفید جھوٹ پر وہ کیسے اعتبار کر لیں گے؟

میں الجھن میں پڑ گیا۔ اسی بیچ ایک ترکیب سوجھی۔ میں نے دکان سے ایک بلیڈ خریدا۔ اور سڑک کے کنارے سناٹے میں کھڑے ہو کر دل کو سخت کرتے ہوئے اپنے ہاتھ پیر کو معمولی طور پر زخمی کرلیا۔ پھر پریشان چہرے کے ساتھ کراہتے ہوئے گھر پہنچا۔ امی کی نظر جیسے ہی میری خستہ حالی

پر پڑی، وہ تڑپ اُٹھیں۔ میری اور سائیکل کا بُرا حال دیکھ کر گھر کے سبھی لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ میں بازار میں ٹھوکر کھا گیا ہوں۔ البتہ چچا جان مجھے عجیب نظروں سے مسلسل گھور رہے تھے۔

''یہ سب کیا معاملہ ہے میاں؟''...ان کا لہجہ بے حد ناگوار تھا۔

میں جواب میں جھوٹی صفائی پیش کرنے لگا۔

''تم سراسر جھوٹ بول رہے ہو۔ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔''

چچا جان گرج پڑے۔اس پر میری سٹّی پٹّی گُم ہو گئی۔میرے تئیں چچا جان کا ایسا سخت رویہ امی کو سخت ناگوارا لگا۔ انھوں نے چچاجان کی کلاس لیتے ہوئے کہا، ''مختار! تم میرے بچے کے چچاجان ہو، یا دُشمنِ جان ہو؟... جب دیکھو اِسے بات بات پر ٹارچر کرتے رہتے ہو۔ میں نے مانا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہوگا، لیکن اِس کی زخمی حالت، پھٹے کپڑے اور ٹوٹی ہوئی سائیکل کو دیکھ کر آخر کیا ظاہر ہوتا ہے؟''

''دیکھیے بھابھی آپ بالکل خاموش رہیں، ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ میں آپ کے صاحب زادے کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ یہ لڑکا اول درجے کا بدمعاش اور جھوٹا ہے۔''

چچا جان کو امی کے ساتھ اِس بے رُخی سے پیش آتے دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہو رہا تھا۔ جی چاہا کہ چچا جان سے کہوں، ''آپ پلیز میری ماں سے تمیز سے پیش آئیں۔ وہ آپ سے بڑی ہیں۔''

لیکن ایسا کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔

''بیٹا، تم کو میری قسم۔ جو سچ ہے، وہی بتاؤ۔'' کہتے ہوئے امی نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے سر پر رکھ دیا۔ نتیجتاً میں سخت اُلجھن میں پڑ گیا۔

کیونکہ میرے سچ بولنے پر یہ طے تھا کہ چچا جان امی پر اور حاوی ہو جاتے۔ جبکہ اب میں کسی بھی قیمت پر اپنی سیدھی سادی اور نہایت مہربان امی کو مزید رُسوائی سے دو چار ہوتے دیکھنا برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اور نہ ہی اُن کے یقین کا خون کرنا گوارا کر سکتا تھا۔ لہٰذا مجھے امی کے سر پر اپنے کانپتے ہاتھ رکھ کر ایک بار پھر جھوٹی قسم کھاتے دیکھ کر چچا جان غصے سے آگ بگولہ ہو اٹھے۔ ساتھ ہی وہ دانت نکوستے ہوئے کسمسا بھی رہے تھے۔

میں چچا جان کی کیفیت بخوبی محسوس کر رہا تھا۔ میں یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ چچا جان میری اصلیت اچھی طرح جان رہے ہیں۔ یقیناً اُن کو کسی نے میرے کرتوت کے بارے میں میرے گھر پہنچنے سے قبل پہلے ہی بتا دیا تھا۔

امی کی نگاہ میں چچا جان کو جھوٹا ثابت کرنا اور چچا جان کی نظر سے میرا اس طرح گر جانا، یہ احساسِ غم مجھے ہمیشہ پریشان کرے گا۔

اسی کے ساتھ بازار سے گھر تک لوٹنے کی اُس مسافت نے میرے ضمیر کو ایسا جھنجھوڑا کہ نہ صرف زمینی سفر، بلکہ نظریاتی اور عملی سفر بھی ہوش مندی سے کرنے کا عادی ہو گیا۔ آج میں بچپن سے پچپن کا ہو گیا ہوں۔ میرا چھوٹا سا ایک پوتا ہے، ارحم عباس عرف ایلیا۔ میں اللہ پاک سے دعا گو ہوں کہ معبود! ارحم میاں کی نازیبا حرکت سے کبھی کسی کا دل نہ دکھے اور وہ اپنی ماں کا بطورِ خاص خیال رکھے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔

■

Manzar Muzaffarpuri
Paighamberpur Kolhwa (Shiatoli)
Pst.: Kolhwa
Distt.: Muzaffarpur - 843108 (Bihar)

محمد ذاکر

کھیلنا بھی ضروری ہے

آؤ بچو! تمھیں ایک نٹ کھٹ بچے کی کہانی سناتا ہوں۔ اس کا نام ندیم تھا۔ اس کی عمر پانچ سال تھی۔ وہ یو۔ کے۔ جی۔ میں پڑھتا تھا۔ وہ صبح سویرے اُٹھ جاتا تھا اور اٹھتے ہی انروائڈ موبائل لے کر بیٹھ جاتا تھا اور گھنٹوں طرح طرح کے گیم کھیلتا تھا۔ جب گھر کے بڑے بزرگ موبائل چھین لیتے تھے تو ٹی۔ وی۔ آن کر کے گھنٹوں ''پوگو'' دیکھتا تھا۔ جب گھر کے لوگ ٹی۔ وی۔ آف کر دیتے تھے تو گھر میں سائیکل نچانے لگتا تھا اور جب گھر کے بڑے سائیکل چھین لیتے تھے تو گھر کے باہر رکھی لکڑی کی سیڑھی پر گھنٹوں کھیلتا رہتا تھا۔ اس کا ایک سبب اسکول کا بند ہونا بھی تھا۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے اس کی کلاس آن لائن چل رہی تھی۔ وہ آن لائن کلاس میں بھی ڈھنگ سے شامل نہیں ہوتا تھا۔ اس کا دن بھر کا روٹین یہی تھا۔

کھیل ہی کھیل۔

پڑھائی کا نام بھی نہیں لیتا تھا۔

اس کے والد شمشاد خان اُس کے لیے بہت فکر مند رہتے تھے۔ اس کی بابت سوچتے تھے:

''میرا یہ بیٹا اور بیٹوں سے علاحدہ ہے۔ میرے بڑے لڑکے اٹھتے کتاب، بیٹھتے کتاب، سوتے کتاب، جاگتے کتاب۔''

کتاب ہی کتاب..........

اور یہ ہے کہ موبائل، ٹی۔ وی، سائیکل اور سیڑھی کے ساتھ وقت گزارتا رہتا تھا۔

''ندیم کی ماں کو بیٹے کی فکر ہے؟''
شمشاد خان نے پوچھا:
''کیا ہوا ہے؟''
''آن لائن کلاس چل رہی ہے، ایک بھی کلاس نہیں کرتا ہے، دن بھر کھیلتا رہتا ہے۔''
''بچہ ہے کھیلے گا نہیں تو کیا کرے گا۔''
ندیم کی ماں مریم نے جواب دیا۔
''کل سے اس کا آن لائن ٹیسٹ شروع ہونے والا ہے، تم ہی جواب دینا۔''
اور اس کے والد نے ندیم کو بلایا اور بتایا کہ:
''کل سے تمھارا آن لائن امتحان ہونے والا ہے۔''
''معلوم ہے مجھے۔''
''تیاری کر لی ہے؟''
''جی۔''
''گنتی سناؤ۔''
ایک سانس میں ایک سے سو (100) تک گنتی سنا دیں۔
والد کی آنکھیں مسکرائیں۔
''اے سے زیڈ تک سناؤ۔''
''سنا دیا۔''
''انگریزی میں کتنے الفابیٹس ہوتے ہیں؟''
''26۔''
''کانسونینٹ کتنے ہوتے ہیں؟''
''21۔''
''واولز کتنے ہوتے ہیں؟''
''5۔''
''گڈ، گڈ......''
والد کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ اب بتاؤ ہندی میں سوور (स्वर) کتنے ہوتے ہیں؟
''14۔''
''وینجن کتنے ہوتے ہیں؟''
''36۔''
''گڈ، گڈ، گڈ..........''
والد نے آخری سوال کیا؟
''کب پڑھتے ہو؟''
جب گیم کھیل لیتا تھا۔
والد کی آنکھوں میں عجیب طرح کی مسکراہٹ پھیل گئی۔

■

Mohd Zakir
Sant Ghat
West Champaran (Bihar)
Mob.: 7764812398

مصنف: لیوٹالسٹائی مترجم: استوتی اگروال

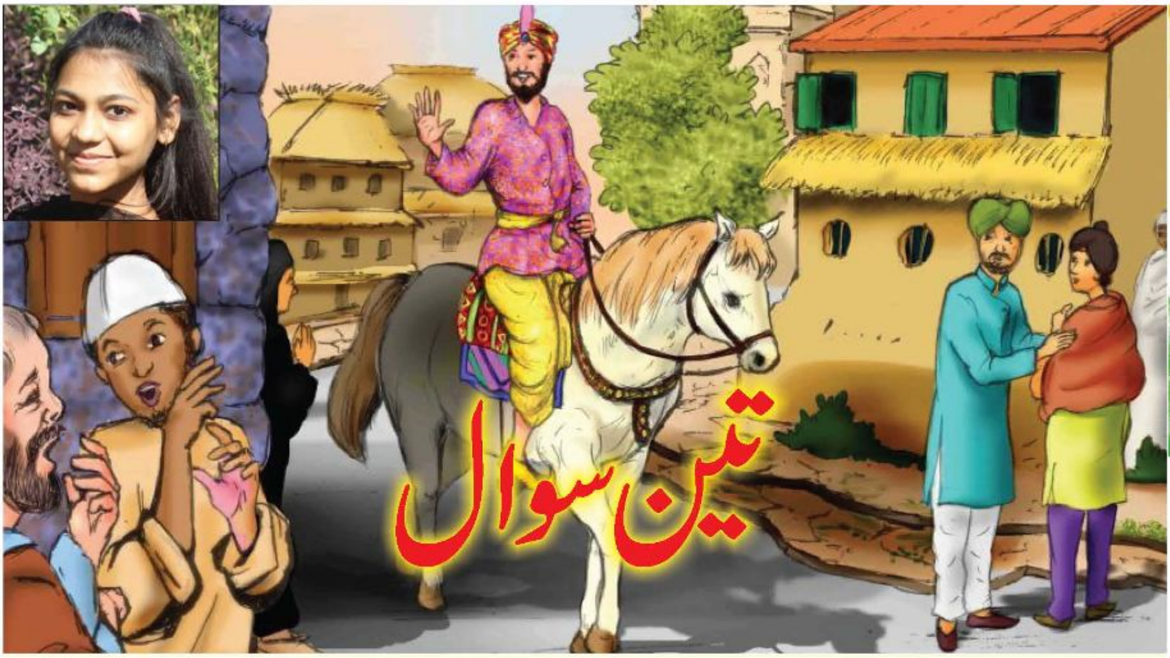

تین سوال

ایک بادشاہ نے سوچا کہ وہ کبھی ناکامیاب نہیں ہوگا اگر وہ تین چیزیں جانتا ہوگا۔ وہ تین چیزیں یہ ہیں:

کسی بھی کام کو شروع کرنے کا صحیح وقت کیا ہے؟ اسے کن لوگوں کو سننا چاہیے؟ اس کے لیے سب سے اہم کام کیا ہے؟

لہٰذا، بادشاہ نے اپنے سپاہیوں کو رعایا کے درمیان میں بھیجا اور یہ وعدہ کیا کہ جس شخص نے بھی ان تینوں سوالوں کے صحیح جواب دیے اسے بڑی رقم دی جائے گی۔

بہت سے عقلمند لوگ بادشاہ کے پاس آئے، لیکن سبھی نے اس کے سوالوں کے جواب مختلف طور پر دیے۔

پہلے سوال کے جواب میں کچھ لوگوں نے کہا کہ لازمی طور پر بادشاہ کو ہر ایک چیز کا نظام الاوقات(Time table) بنانا چاہیے اور سختی سے اس کی پیروی کرنی چاہیے۔ کچھ لوگوں نے کہا، ''کیا وہ مناسب وقت پر سب کچھ کر سکتے ہیں؟'' دوسروں نے کہا کہ کچھ کرنے کے لیے صحیح وقت سے پہلے فیصلہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ بادشاہ کو ان سبھی چیزوں پر غور کرنا چاہیے جو چل رہا ہے، بے وقوفوں کی تعریف سے پرہیز کریں اور ہمیشہ وہی کریں جو ضروری لگتا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ بادشاہ کو دانشمندوں کی ضرورت ہے جو مناسب وقت پر کام کرنے میں ان کی مدد کریں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک شخص کو دوسرے کی مدد کے بغیر صحیح طریقے سے فیصلہ کرنا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

لیکن پھر کچھ لوگوں نے کہا کہ کچھ فیصلے ایسے بھی ہیں جنھیں فوری طور پر لیا جاتا ہے۔ یہ فیصلے کسی دانشور کا انتظار نہیں کر سکتے۔ کچھ کرنے کے لیے، صحیح وقت کا فیصلہ کرنے کے لیے مستقبل کو دیکھنا ضروری ہے اور یہ کام صرف جادوگر ہی کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے بادشاہ کو جادوگروں کے پاس جانا پڑتا۔

دوسرے سوال کے جواب میں کچھ لوگوں نے کہا کہ بادشاہ کے لیے سب سے ضروری اس کے منتری ہیں، کچھ نے پجاری اور چند لوگوں نے حکیموں کے بارے میں کہا اور دوسروں نے بادشاہ کے فوجیوں کو ضروری بتایا۔

تیسرے سوال پر کچھ لوگوں نے علم کہا۔ کچھ نے لڑائی اور

چندلوگوں نے مذہبی عبادت کو اہمیت دی۔

بادشاہ کے سوالوں کے جوابات مختلف تھے، بادشاہ مطمئن نہیں ہوا اور اس نے کوئی انعام نہیں دیا۔ اِس کے بجائے بادشاہ نے کسی سادھو سے مشورہ لینے کا فیصلہ کیا، جو اپنی دانشمندی کے لیے بڑے پیمانے پر جانا جاتا ہو۔

سادھو جنگل میں اکیلا رہتا تھا۔ وہ بالکل عام آدمی کی طرح نظر آتا تھا، بادشاہ بھی جنگل بھیس بدل کر گیا۔ سادھو کی جھونپڑی میں پہنچنے سے پہلے بادشاہ نے اپنا گھوڑا جنگل میں چھوڑ دیا، اور اکیلا آگے بڑھ گیا۔

جیسے ہی بادشاہ جھونپڑی کے قریب آیا اس نے دیکھا کہ سادھو اپنی جھونپڑی کے سامنے زمین کھود رہا ہے۔ اس نے بادشاہ کو سلام کیا اور اپنے کام میں مصروف رہا۔ سادھو بوڑھا اور کمزور تھا اور کام کرتے کرتے گہری سانسیں لے رہا تھا۔

بادشاہ اس سادھو کے پاس گیا اور بولا، ''اے عقلمند سادھو! میں آپ کے پاس تین سوالوں کے جواب پوچھنے آیا ہوں۔ میں صحیح وقت پر صحیح کام کرنا کیسے سیکھ سکتا ہوں؟ وہ لوگ کون ہیں جن کی مجھے زیادہ ضرورت ہے؟ اور کون سے کام میرے لیے زیادہ ضروری ہیں؟''

سادھو بادشاہ کی باتیں سنتا رہا، لیکن کچھ نہ بولا۔ وہ زمین کھودنے میں لگا رہا۔ ''آپ تھک چکے ہیں'' بادشاہ نے کہا۔ ''لائیے اپنا بیلچہ (Spade) مجھے دیجیے۔ میں آپ کی جگہ کام کرنا چاہتا ہوں۔''

''شکریہ'' سادھو نے اپنا بیلچہ دیتے ہوئے کہا۔ پھر وہ زمین پر بیٹھ گیا۔

جب بادشاہ آدھے گھنٹے تک زمین کھودتا رہا تو وہ رک گیا اور اس نے اپنے سوالات پھر دہرائے۔ سادھو نے کوئی جواب نہ دیا، لیکن کھڑا ہو گیا اور بیلچے کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور کہا، ''اب تم آرام کرو اور مجھے کام کرنے دو۔''

لیکن بادشاہ نے بیلچہ نہیں دیا اور کھودنا جاری رکھا۔
ایک گھنٹہ گزر گیا اور پھر دوسرا۔ سورج پیڑوں کے پیچھے چلا گیا۔ آخر کار بادشاہ نے بیلچہ زمین میں پھنسا دیا اور کہا، ''عقلمند آدمی! میں اپنے سوالوں کے جواب کے لیے آپ کے پاس آیا ہوں۔ اگر آپ مجھے جواب نہیں دے سکتے تو بتا دیجیے میں گھر چلا جاؤں گا۔''

''یہاں کوئی دوڑتا ہوا آ رہا ہے۔'' سادھو نے کہا۔ بادشاہ نے مڑ کر دیکھا کہ ایک داڑھی والا شخص اس کی طرف بھاگا چلا آ رہا ہے۔ اپنے ہاتھوں سے وہ اپنے پیٹ کو دبائے ہوئے ہے، جس سے خون بہہ رہا ہے۔ جیسے ہی وہ بادشاہ کے پاس پہنچا وہ بے ہوش ہو گیا اور زمین پر گر پڑا۔ بادشاہ اور سادھو نے اس شخص کے کپڑے نکالے اور اس کے پیٹ میں ایک گہرا زخم پایا۔ بادشاہ نے اسے ایک رومال سے ڈھک دیا، لیکن خون بہنا بند نہیں ہوا۔ بادشاہ نے زخم کو دوبارہ ملبوس کیا جب تک کہ خون بہنا بند نہیں ہوا۔

اس شخص نے بہتر محسوس کیا اور کچھ پینے کو مانگا۔ بادشاہ اس کے لیے تازہ پانی لے کر آیا اور اسے دے دیا۔ اس وقت تک سورج ڈوب چکا تھا اور اب ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ بادشاہ نے سادھو کی مدد سے اس شخص کو جھونپڑی میں لے جا کر بستر پر رکھ دیا۔ اس شخص نے آنکھیں بند کر لیں اور خاموش رہا۔ بادشاہ، اپنی دن بھر کی محنت و مشقت سے تھک چکا تھا، اس لیے وہ زمین پر ہی سو گیا اور رات بھر سوتا رہا۔ جب وہ سو کر اٹھا تو اسے چند منٹ ہی یاد کرنے میں لگے کہ وہ کہاں ہے؟ اور بستر پہ لیٹا ہوا آدمی کون ہے؟

''مجھے معاف کر دیجیے!'' داڑھی والے نے کمزور آواز میں کہا، جب اس نے دیکھا کہ بادشاہ جاگ اٹھا ہے۔
''میں تمھیں نہیں جانتا اور تمھیں معاف کرنے کے لیے میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔'' بادشاہ نے کہا۔
''آپ مجھے نہیں جانتے، لیکن میں جانتا ہوں۔ میں آپ کا وہ دشمن ہوں جس نے آپ سے بدلہ لینے کی قسم اس لیے کھائی تھی کیونکہ آپ نے میرے بھائی کو پھانسی پر لٹکا دیا تھا اور میری زمین اپنے قبضے میں لے لی تھی۔ میں جانتا تھا کہ آپ اکیلے ہیں اور ایک سادھو سے ملنے جا رہے ہیں، اس لیے میں نے گھر جاتے ہوئے آپ کو مارنے کا ذہن بنایا تھا، لیکن دن گزر گیا آپ واپس نہیں آئے لہٰذا میں نے چھپنے کی جگہ چھوڑ دی اور غلطی سے آپ کے محافظ (Bodyguard) کے پاس آ گیا جس نے مجھے پہچان لیا اور زخمی کر دیا۔ میں اس سے بچ گیا تھا، لیکن اگر آپ نے میرے زخموں کو نہیں ملبوس کیا ہوتا تو میں مر ہی جاتا۔ میں آپ کو مار ڈالنا چاہتا تھا، لیکن آپ نے میری جان بچائی۔ اب، اگر میں زندہ رہتا ہوں تو آپ کی سب سے وفادار نوکر کی حیثیت سے خدمت کروں گا اور اپنے بیٹوں کو بھی ایسا ہی کرنے کا حکم دوں گا۔ مجھے معاف کر دیں بادشاہ!''

بادشاہ بہت خوش تھا کہ اس نے اتنی آسانی سے اپنے دشمن سے صلح کر لی ہے، اور دوست کے طور پر اس کا دل جیت لیا ہے۔ اس نے نہ صرف اسے معاف کیا، بلکہ کہا کہ وہ اپنے نوکروں اور حکیموں کو اس کی دیکھ بھال کے لیے بھیجے گا اور ساتھ ہی اس کی زمین واپس دینا کا بھی وعدہ کیا۔

زخمی شخص کو چھوڑ کر بادشاہ جھونپڑی سے باہر گیا اور سادھو کی تلاش کرنے لگا۔ جانے سے پہلے اس نے ایک بار پھر اپنے سوالات کے جواب حاصل کرنے کی خواہش کی۔ سادھو اپنے گھٹنوں پر بیٹھا اس زمین میں بیج بو رہا تھا جسے وہ کھود چکا تھا۔ بادشاہ سادھو کے پاس گیا اور بولا، ''اے عظیم انسان! میں آپ سے آخری بار التجا کر رہا ہوں کہ میرے سوالوں کے جواب دیں۔''

''تمھیں پہلے ہی جواب دیا جا چکا ہے!'' سادھو نے نیچے کی طرف جھکتے ہوئے بادشاہ کی طرف دیکھا جب وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔

''مجھے کیسے جواب دیا گیا ہے؟ آپ کا کیا مطلب ہے؟''

کیا تم نہیں دیکھ رہے ہو؟'' سادھو نے کہا۔ ''اگر تم میری کمزوری پر رحم نہ کرتے اور میرے لیے زمین نہ کھودتے تو تم چلے جاتے۔ پھر وہ شخص تم پر حملہ کرتا اور تمھاری خواہش ہوتی کہ کاش! میں سادھو کے ساتھ ہوتا۔ لہٰذا سب سے اہم وقت وہ تھا جب تم زمین کھود رہے تھے اس وقت میں سب سے ضروری آدمی تھا اور میرے ساتھ اچھا سلوک کرنا تمھارا سب سے اہم کام تھا۔ اس کے بعد، جب وہ آدمی ہماری طرف بھاگا، تو سب سے اہم وقت وہ تھا جب تم اس کی دیکھ بھال کر رہے تھے، کیونکہ اگر تم اس کے زخموں کو نہیں بھرتے تو وہ بغیر امن وشانتی کے مر جاتا۔ تم نے جو بھی اس کے لیے کیا وہ تمھارا فرض تھا۔

''یاد رکھو، صرف ایک ہی وقت ہے جو سب سے اہم ہے اور وہ وقت ہے، ''ابھی''۔ یہ سب سے اہم وقت ہے کیونکہ اس وقت پر ہمارے پاس عمل کرنے کی طاقت ہوتی ہے۔

''سب سے ضروری شخص وہ شخص ہوتا ہے جس کے ساتھ آپ اس خاص وقت پر موجود ہوں، کیونکہ کوئی نہیں جانتا کہ آئندہ مستقبل میں کیا ہوگا اور کیا ہم کسی اور سے ملیں گے اور سب سے ضروری کام ہر انسان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے، کیونکہ ہمیں اِس دنیا میں صرف اسی مقصد سے بھیجا گیا ہے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

■

Stuti Agrawal
Agrawal Jewellers
Sironj - 464228 (MP)
Mob.: 9575089694

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.......................... بتاریخ..........................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

حوصلوں کی اڑان

عبدالوہاب قاسمی

پیارے بچو......!

ایک طالب علم کے لیے کتابیں سب سے قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے لیے جہاں بہت سے ادیب اور شاعر کتابیں لکھتے ہیں وہیں قومی کونسل جیسے ادارے ان کتابوں کو چھاپ کر آپ تک پہنچاتے ہیں۔ آج ہم آپ کو آپ کے شاعر ڈاکٹر ظفر کمالی سے ملواتے ہیں۔

ظفر کمالی بچوں کے لیے بہت فکر مند رہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ ایک اچھے اور کامیاب انسان بنیں۔ آپ میں ہمّت، جرأت، حوصلے اور کام کی دھن جیسی اچھی اچھی خوبیاں پیدا ہوں۔ انھوں نے آپ کے لیے اب تک تین کتابیں لکھی ہیں۔ 'بچوں کا باغ'، 'چہکاریں' (رباعی) اور 'حوصلوں کی اڑان'۔

'حوصلوں کی اڑان' میں ظفر کمالی نے چالیس نظمیں کہی ہیں جن میں تعلیم، اسکول، کتاب، قلم، ماحولیات، فطرت، ہمدردی، رشتوں کی پاسداری، حبُّ الوطنی، بہادری، پرندے، جانور اور سیر وتفریح جیسے موضوعات شامل ہیں۔

پیارے بچو......! آپ کو گھومنا پھرنا، اچھلنا، کودنا، شرارتیں کرنا بہت پسند ہے نا اسی لیے ظفر کمالی نے آپ کی اس پسند کو اپنی کئی نظموں میں خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ گڈّے کی برات، بلّی، آئس کریم کھائیں، سلامت رہے اور گوریّا رانی جیسی نظموں میں بچوں کی البیلی فطرت اور معصوم اداؤں کو پیش کیا ہے۔

'میرا بکرا' یہ ایسی نظم ہے جس کو بچے بار بار پڑھنا پسند کریں گے۔ اس میں بھرپور دل چسپی کی فضا پیدا کی گئی ہے۔ اس میں ایک بچہ اپنے بکرے کو پڑھانے کی تمنّا لیے کہتا ہے۔

مرا بکرا نہیں پڑھتا ہے میں اس کو پڑھاؤں گا
اسے عالم بناؤں گا اسے فاضل بناؤں گا

اس طرح وہ بچہ اپنے بکرے کو عالم فاضل بنانے کے لیے خوب مزے مزے کی باتیں کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے میں اپنے بکرے کو ٹوپی پہناؤں گا، وہ روئے گا تو ہنساؤں گا اور ٹافی بسکٹ کھلاؤں گا۔ میرا بکرا گردن میں بستہ لٹکائے اسکول جائے گا، وہ اردو، ہندی اور انگریزی بولے گا، میں اسے قصّے سناؤں گا، وہ کرکٹ بھی کھیلے گا، اسٹیج پر اس کی تقریر بھی ہوگی اور یہاں تک کہ وہ بکرستان کا پی۔ ایم بھی بنے گا۔

تو آپ نے دیکھا بچو......! آپ کے ظفر کمالی نے اس نظم میں آپ کے دل کی باتیں کہی ہیں۔ وہ ایسے شاعر ہیں جو زیادہ تر آپ ہی کے دل کی باتیں کرتے ہیں۔ وہ بھی آپ کی طرح کبھی بچے ہی تھے اسی لیے انھیں معلوم ہے کہ آپ کی دلچسپی کن چیزوں میں ہے۔

'چک بم چک بم' اس کتاب کی ایک اچھی اور اہم نظم ہے۔ اس میں جو نغمگی ہے وہ بچوں کو متاثر کرتی ہے۔ یہ نظم روانی میں بے مثال ہے۔ چھوٹے چھوٹے مصرعوں پر مشتمل یہ نظم بچوں کی زبان کے بالکل قریب ہے۔ آپ ایک بار پڑھنا

شروع کریں گے تو پڑھتے ہی چلے جائیں گے۔ آیئے مل کر ایک بند پڑھتے ہیں۔

محنت ہم کو پیاری ہے　　اس سے اپنی یاری ہے
خوابوں کی بیداری ہے　　آگے بڑھنا جاری ہے
چک بم چک بم چک بم بم
اچھے سچّے بچّے ہم

بچو......! ظفر کمالی نے آپ کے اندر ہمّت اور حوصلہ پیدا کرنے کے لیے کئی نظمیں لکھی ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ آپ کے اندر نئے جوش وخروش اور ولولوں کا طوفان موجود ہوتا ہے۔ اس کو محض ابھارنا اور صحیح سمت دکھانا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی ایسی نظموں کو پڑھ کر آپ کو رہنمائی مل سکتی ہے۔ ہوں گے جب ہم جواں، حوصلوں کی اڑان، چیونٹیوں کی قطار، کام کریں اور 'آگے بڑھتے جائیں' جیسی نظموں کو پڑھنے کے بعد آپ اپنے اندر ایک طاقت اور توانائی محسوس کریں گے۔ چند اشعار پڑھیے یقیناً آپ جوش سے بھر جائیں گے۔

جوش اور ولولے ہیں جن کے غلام
ان کو آتے ہیں منزلوں کے سلام
بپھری موجوں کی چھاتی پر چڑھ جائے گا سفینہ
سرکش دریاؤں کا مِل کر چیریں گے ہم سینہ

دیکھیے کتنی آسان زبان میں بہادری کی کیسی کیسی باتیں کہہ دی گئی ہیں۔

بچو......! ظفر کمالی کے یہاں آپ کو بہت سے موضوعات ملیں گے جن میں آپ کو نیا پن محسوس ہوگا۔ اب یہی دیکھیے کہ انھوں نے الفت ومحبت اور ہمدردی وغم خواری کی باتوں کو کتنے دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے۔

ہے ترقی کی شاہ راہ یہی　　اپنی پگڑی یہی کلاہ یہی
اپنی طاقت یہی سپاہ یہی　　دشمنوں کو کرے تباہ یہی
بھائی چارہ بہت ضروری ہے

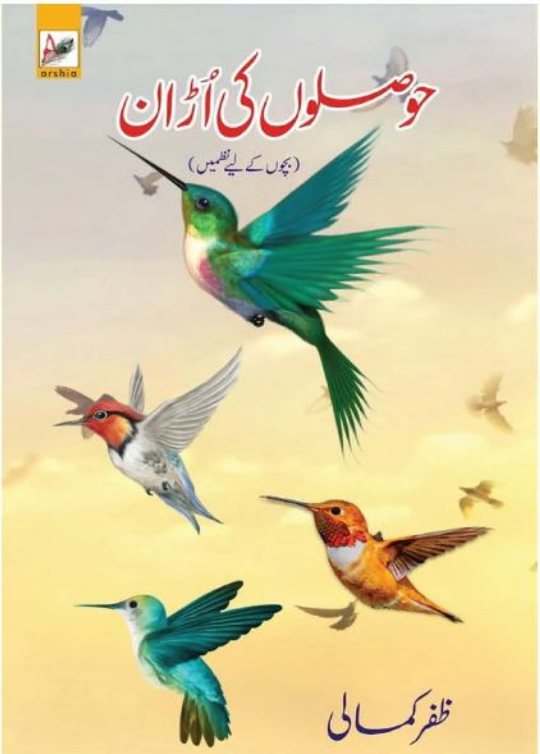

حوصلوں کی اڑان، شاعر: ظفر کمالی، صفحات: 160، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2020، ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامع مسجد، نئی دہلی

بچو......! ظفر کمالی نے آپ کے لیے اچھی شاعری کا نمونہ پیش کیا ہے۔ ان کی زبان آسان ہوتی ہے اور انداز بھی پیارا ہوتا ہے۔ اس لیے اس کتاب کو ضرور پڑھیے، بہت لطف آئے گا۔ کتاب کے آخر میں آپ کی آسانی کے لیے کچھ مشکل الفاظ کے معانی بھی موجود ہیں۔ کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے۔ آپ کو بہت پسند آئے گی۔

■

Abdul Wahab Qasmi
Iqra Public School
Soora Pur Haque Nagar
Siwan - 841226 (Bihar)
Mob.:7631677978

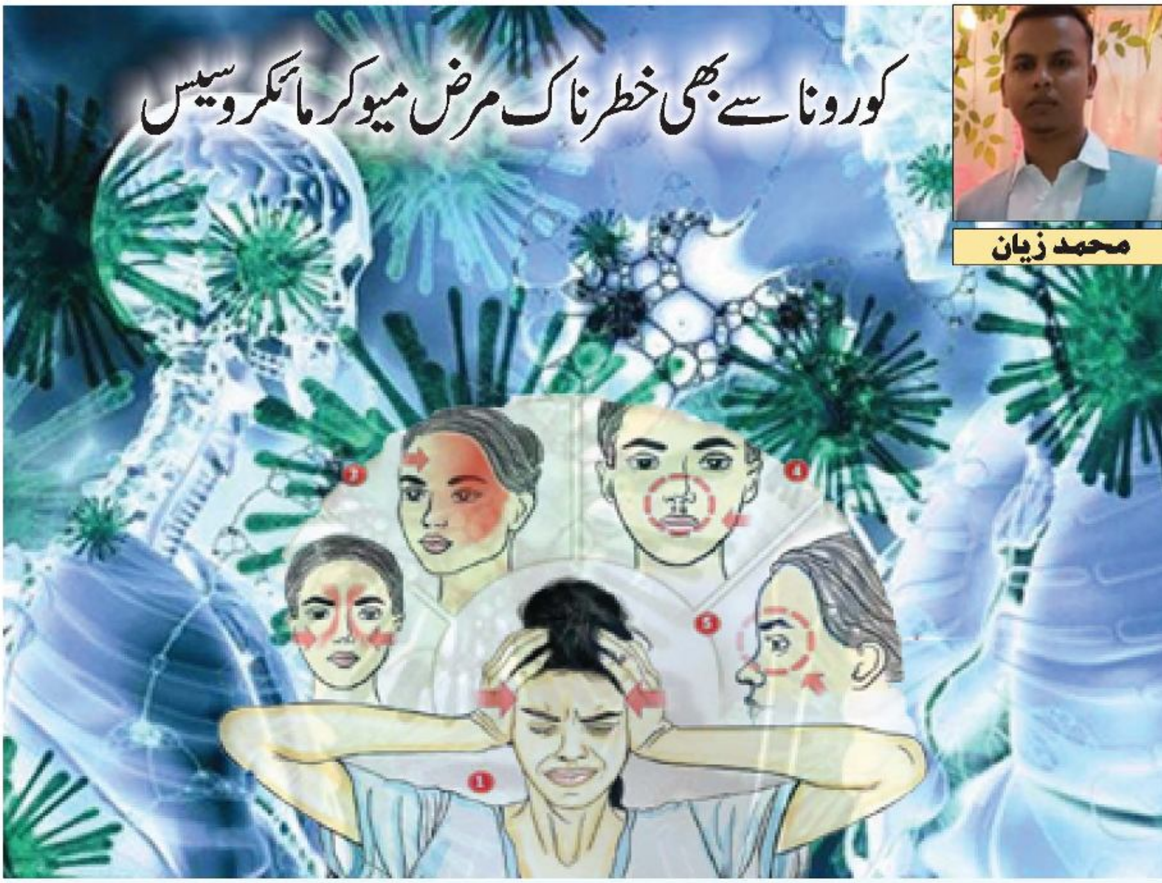

کورونا سے بھی خطرناک مرض میوکر مائکروسیس

محمد زیان

کورونا نے پوری دنیا کو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ایسے ممالک جو خود کو سپر پاور سمجھتے تھے، انھیں بھی اس وبائی مرض نے اپنی اوقات دکھا دی ہے۔کووڈ 19 نے کچھ غیر معروف الفاظ کو بھی رات ورات اسٹار بنا دیا ہے۔

جیسے کورینٹائن (قرنطینہ) ، لاک ڈاؤن، سوشل ڈسٹنسنگ وغیرہ۔ اس مہا ماری سے لڑنے کے لیے ہمارے ملک میں بھی کئی اقدامات اٹھائے گئے مگر اسی بیچ ہزاروں افراد اس کے سبب ہلاک ہو گئے اور لاکھوں نے اس کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا اور روبہ صحت ہوئے مگر یہ کیا! ان میں سے کئی افراد کو میوکر مائکروسیس (بلیک فنگس) نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔

آیئے آپ کو بتاتے ہیں کہ بلیک فنگس (سیاہ پھپوند) دراصل ہے کیا، اس کی علامتیں کیا ہیں، اس سے بچاؤ کے لیے کونسی احتیاط کی جانی چاہئیں اور اس کا علاج کیا ہے۔دراصل اس بیماری کے بیکٹیریا یہاں وہاں ہر جگہ پائے جاتے ہیں مگر اس سے متاثر وہی ہوتا ہے جس کی قوت مدافعت (Immunity) کمزور ہوتی ہے۔کورونا کے مریضوں میں صحت یابی کے بعد بلیک فنگس کے لاحق ہونے کے زیادہ خدشات ہیں مگر وہ افراد بھی اس سے متاثر ہو رہے ہیں جنھیں کورونا نہیں ہوا تھا لیکن ان کی Immunity انتہائی کمزور تھی۔

اپنی قوت مدافعت کس طرح بڑھائیں:

ہر شہری کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنی Immunity کو مضبوط بنائے۔ اس کے لیے درج ذیل امور کیے جانے چاہئیں:

1 رات میں جلدی سوئیں اور صبح جلد جاگ جائیں۔
2 سحر خیزی (Walkmorning) سے لطف اندوز ہوں۔
3 طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب کی دھوپ جسم پر لیں تاکہ بھرپور مقدار میں وٹامن سی مل سکے۔
4 صبح ناشتے میں ابلے ہوئے انڈے کی سفیدی، دودھ، ابلے ہوئے مٹ، چنے وغیرہ کھائیں۔
5 کھانا بھوک سے کچھ کم کھائیں اور متوازن غذا کا استعمال کریں۔
6 کھجور اور خشک میوے، گڑ اور مونگ پھلی کے دانوں کو اپنی غذا میں شامل کریں وغیرہ۔

بلیک فنگس کی علامتیں:

1 آنکھ یا ناک یا دونوں میں درد ہونا۔
2 بخار آنا
3 سانس لینے میں دشواری ہونا۔
4 سینے میں درد۔
5 ناک سے خون یا کالا مواد بہنا۔
6 جسم پر کالے رنگ کے دھبے ظاہر ہونا۔
7 نظر متاثر ہونا وغیرہ وغیرہ

حیرانی اور فکرمندی کی بات یہ ہے کہ اس کے مریضوں کے ٹھیک ہونے کا فیصد صرف 50% بتایا جاتا ہے۔

احتیاطی تدابیر :

1 ہمیشہ ماسک کا استعمال کریں اور ماسک کو اچھی طرح دھو کر ہی دوبارہ استعمال کیجیے۔
2 اپنی Immunity کو مضبوط کرنے کے لیے سنجیدگی کا مظاہرہ کریں۔
3 شوگر کی مقدار جسم میں نہ زیادہ بڑھنے دیں اور نہ ہی کم ہونے دیں۔
4 سبزیوں اور پھلوں کو اچھی طرح دھو کر استعمال کریں۔
5 دھول مٹی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔
6 بار بار ہاتھ دھوئیں اور سماجی فاصلہ بنائے رکھیں وغیرہ وغیرہ۔

علاج:

اگر کسی شخص کو اپنے اندر سیاہ پھپھوند کی علامات محسوس ہوتی ہیں تو وقت ضائع کیے بغیر ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ ابتدائی مراحل میں اس مرض کی تشخیص اگر ہو جائے تو علاج میں آسانی ہو جاتی ہے لیکن اگر تاخیر ہو جائے تو لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ یہ مرض ناک سے شروع ہوتا ہے اگر ناک کے اندر کھپلی (سخت حصہ) آجائے تو فوری طور پر ڈاکٹر سے رابطہ کرنا چاہیے۔ بلیک فنگس ناک سے منہ، منہ سے آنکھوں اور آنکھوں سے دماغ کا سفر کرتا ہے۔ جب یہ دماغ تک پہنچ جاتا ہے تو سمجھ لیجیے مشکلیں بہت بڑھ گئیں۔ اس کی ادویات اور انجکشن مہنگے ہوتے ہیں اور اگر خدا نخواستہ آپریشن کی نوبت آجائے تو پھر اللہ کی پناہ۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شوگر کے مریض، کورونا کے مریض، جو آئی سی یو میں رہے، Post transplant اور میلیگننسی وغیرہ کے مریضوں کو بہت محتاط رہنا چاہیے۔ یہ ہمارے لیے اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ پانچ وقت کی نماز ہم پر فرض کی گئی ہے۔ دن میں پانچ مرتبہ اچھی طرح وضو کیا جائے تو ناک منہ اور چہرے کے تمام بیکٹیریا دھل جاتے ہیں۔ کورونا ابھی گیا نہیں ہے دوسری طرف بلیک فنگس نے سر ابھارا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ کورونا پروٹوکول کا خیال رکھیں اور بلیک فنگس سے بچاؤ کے لیے بھرپور احتیاط کریں۔

■

Mohammad Zayyan
104 Usmaniya Park Shivaji Nagar
Jalgaon - 425001 (Maharashtra)
Mob:8625895757

محاورے

فلکیاتی محاورے:

جن میں فضائے اعلیٰ کے مظاہر کا بڑا حصہ ہے:

آسمان ٹوٹ پڑنا۔

آسمان پر داغ ہونا۔

زمین آسمان کے قلابے ملانا

آنکھوں کا تارا

ستارہ چمکنا

گہنانا (زوال ہونا)

تارا ہو جانا۔

سورج مکھی۔

قطبین کا فرق۔

عددی محاورے:

وہ محاورے جن میں عدد ہی سے معنی پیدا ہوتے ہیں یا عدد جزو اعظم ہو:

تین تیرہ ہونا (تباہ، برباد، تتر بتر ہونا)

پو بارہ ہیں اب تو (خوب مزے ہیں)

تین پانچ کرنا (خواہ مخواہ کی حجت کرنا)

اُنیس بیس کا فرق (بہت تھوڑا فرق)

ایک آنکھ نہ بھانا (ذرا بھی پسند نہ آنا)

چار دن کی چاندنی پھر اندھیرا پاکھ (ہر کمال کو زوال)

آٹھ آٹھ آنسو رونا (زار و قطار رونا)

رزم اور شجاعت کے محاورے

ہماری زبان رزم اور شجاعت کے محاوروں سے معمور ہے۔ چند یہاں دیے جاتے ہیں:

رن پڑنا (جنگ، سنگرام ہونا)

رن چڑھنا (جنگ میں شریک ہونا، لڑنا)

کام آنا (لڑائی میں مارا جانا)

گھمسان کا رن (بہت سخت اور خونریز لڑائی)

کھیت رہنا (لڑائی میں مارا جانا)

چورنگ کرنا (دشمن کے بدن کے چار ٹکرے کر دینا)

رنجک چاٹنا (توپ کے پیالے کی بارود پھُسپھسا کر رہ جائے اور توپ نہ چلے)

گولا اُگلنا (توپ سیلی بارود یا ڈھیلی بھری جانے سے چلے نہیں اور گولا اس کے منہ سے نکل پڑے)

تسمہ نہ چھوڑنا یا لگا رکھنا (قتلے قتلے کر دینا)

گھونگھٹ کھانا (فوج کی صفوں کا پیچھے ہٹنا)

مورچا باندھنا (توپوں کو فوج یا معسکر کے آگے قائم کرنا)

ہلہ بولنا (ایک دم سے حملہ کر دینا)

تلوار کے گھاٹ اتارنا (تلوار سے مار ڈالنا)

بال باندھا تیر لگانا (تیرانداز کی اعلیٰ ترین صفت)

چپقلش میں پڑنا (مشکل میں پھنسنا)

جان پر کھیلنا (جوکھوں سے بال بال بچ کر)

دوسرے کے کندھے پر بندوق رکھ کر چلانا (آپا دیکھنا)

شیر کے کلّے چیر ڈالے (نہایت بہادر اور طاقتور)

کلّے ٹھلّے کا جوان (قوی ہیکل)

■

ماخذ: کیفیہ، مصنف: برج موہن دتاتریہ کیفی، پہلی اشاعت: 2019، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

معلومات عامہ

س: ہندوستان کی سب سے لمبی ندی کون سی ہے؟

ج: گنگا

س: جنوبی ہند کی سب سے لمبی ندی کون سی ہے؟

ج: گوداوری

س: ہندوستان میں کتنے اہم دریا ہیں؟

ج: نو (9): گنگا، جمنا، برہما پتر، مہاندی، نرمدا، گوداوری، تاپتی، کرشنا، کاویری

س: ہندوستان کا سب سے چھوٹا دریا کون سا ہے؟

ج: اروَاری، یہ راجستھان میں بہتا ہے، اس کی لمبائی محض 90 کلومیٹر ہے۔

س: دنیا کی سب سے بڑی جھیل کا نام کیا ہے؟

ج: بحیرہ کیپسین۔

س: ہندوستان کی آفیشیل زبان کون سی ہے؟

ج: ہندی

س: آثار الصنادید کس کی تصنیف ہے؟

ج: سر سید احمد خان

س: مراۃ العروس کس کا ناول ہے؟

ج: ڈپٹی نذیر احمد

س: وہ کون سا جانور ہے جو ناک اور منہ کے علاوہ کھال سے بھی سانس لیتا ہے؟

ج: مینڈک

س: ایسے کون سے جانور ہیں جن کے دانت ساری عمر بڑھتے رہتے ہیں؟

ج: ہاتھی اور چوہا

س: بھیڑیا کس ملک کا قومی نشان ہے؟

ج: ترکی

س: وہ کون سا جاندار ہے جس کے دو دماغ ہوتے ہیں؟

ج: بندر

س: وہ کون سا ملک ہے جہاں پیدا ہوتے ہی بچے کی عمر 9 ماہ لکھ دی جاتی ہے؟

ج: جاپان

س: دنیا کا سب سے بڑا صنعتی شہر کون سا ہے؟

ج: شنگھائی

س: سب سے پہلے نوٹوں کا آغاز کس ملک سے ہوا؟

ج: چین

س: دنیا میں سب سے بڑی سونے کی کانیں کہاں ہیں؟

ج: جنوبی افریقہ کے شہر جوہانسبرگ میں

س: دنیا کے کس ملک کے مرد و عورت پڑھے لکھے ہیں؟

ج: ڈنمارک

س: دنیا میں سب سے زیادہ بکنے والی چیز کون سی ہے؟

ج: سگریٹ

س: وہ کون سا درخت ہے جس کا تنا بہت موٹا ہوتا ہے مگر اس میں لکڑی نہیں ہوتی ہے؟

ج: کیلے کا

عبدالودود انصاری

انجیر: انسانی افادیت کا پہلا درخت

صحت ہی زندگی ہے، یہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا۔ کچھ اسی طرح کی بات اردو کے ایک شاعر نے بھی کہی ہے:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک　　تندرستی ہزار نعمت ہے

صحت اور تندرستی زندگی کے لیے بہت لازمی ہیں۔ ذہنی صحت کے لیے جسمانی صحت کی ضرورت پڑتی ہے اسی لیے اگر شروع سے ہی صحت اور تندرستی کے تعلق سے لاپرواہی کے بجائے بیداری کا رویہ اختیار کیا جائے تو انسان بہت ساری بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ ہمارے عہد میں بچوں کی صحت ایک بڑا مسئلہ ہے، اس پر سنجیدگی سے توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی صحت کے تعلق سے 'بچوں کی دنیا' میں یہ کالم اس لیے شروع کیا گیا ہے تاکہ والدین کے ساتھ ساتھ بچے خود بھی اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رکھ سکیں۔

آج بھی انسان 'تندرستی ہزار نعمت ہے' کی روشنی میں اپنی زندگی گزارنے کی کوشش کر رہا ہے مگر جب تندرستی کے اصولوں سے انحراف کرتا ہے تو پھر وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کی نظر ڈاکٹر کی جانب جاتی ہے۔ ڈاکٹر دوائیاں تجویز کرتا ہے مریض ان کو استعمال کر کے صحت یاب بھی ہوتا ہے۔ اگر ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائیاں نہ ملیں تو پھر دیکھیے کہ مریض کو اس دوا کے لیے نہ جانے کتنی دکانوں کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ اگر علاقے میں دستیاب نہ ہوں تو دور دراز جگہوں سے بھی منگوانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یقیناً ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ انسان مرض سے نجات پانے کے لیے دوا پر زیادہ یقین رکھتا ہے۔ حیرت ہے کہ مسلمان جس نبیؐ کے ماننے والے ہیں، انھوں نے بہت سی قدرتی اشیا کی خصوصیات ایسی بتائی ہیں جن کے استعمال سے انسان بھرپور مستفیض ہوسکتا ہے مگر دنیا کے انسانوں اور خاص کر مسلمانوں کی شومئ قسمت دیکھیے کہ اس طرف ان کا دھیان بھی نہیں جاتا ہے ورنہ ہر مرض کی دوا 'صلِّ علیٰ محمدؐ'۔ آپ دیکھیں کہ انسان جتنا کولگیٹ اور دیگر ٹوتھ پیسٹ پر یقین رکھتا ہے اتنا مسواک پر نہیں جب کہ پیارے نبیؐ نے مسواک کے ستر فائدے بتائے ہیں۔ دانت کی کون سی بیماری ہے جو مسواک سے دور نہیں ہوتی ہے۔ آج دوسروں کی بات چھوڑیے کتنے مسلمان اسے استعمال کرتے ہیں۔ آپ یقین جانیے آج ذرائع ابلاغ نیم کی مسواک کی صحیح افادیت کو مشتہر کرنے لگیں تو پھر دیکھیے کہ کس طرح لوگ مسواک پر ٹوٹ پڑیں گے۔ یہ تو صرف ایک مثال ہوئی ورنہ ہزاروں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ آیئے آج

اسلام اور حکمت کے نقطۂ نظر کی روشنی میں ایک پھل 'انجیر' کی افادیت کی جانکاری حاصل کریں۔

انجیر فارسی لفظ ہے جسے عربی میں تین کہتے ہیں۔انجیر کی انگریزی Fig ہے جب کہ اس کا سائنسی نام Ficus carica ہے۔ انجیر کا اصل وطن ایشیائے کوچک اور مشرقی وسطیٰ ہے مگر آج اس کی کاشت ترکی، یونان، اٹلی، الجیریا، اسپین، پرتگال، امریکہ، ساؤتھ افریقہ وغیرہ ممالک کے علاوہ ہندوستان اور پاکستان میں بھی خوب ہو رہی ہے۔انجیر کی افادیت کا مسلم ثبوت سورہ 'التین' ہے جس میں اللہ پاک نے اس پھل کی قسم کھائی ہے:

''قسم ہے انجیر(کے درخت) کی اور زیتون (کے درخت) کی اور طور سینین کی اور اس امن والے شہر (یعنی مکہ معظّمہ) کی کہ ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔'' (التین:1-4)

اس پھل کا ذکر نہ صرف قرآن پاک میں ہے بلکہ توریت اور انجیل میں کم وبیش 49 بار آیا ہے۔ایک مقام پر آیا ہے:

''... تب درختوں نے انجیر کے درخت سے کہا تو آ اور ہم پر سلطنت کر۔ پر انجیر کے درخت نے کہا کیا میں اپنی مٹھاس اور اچھے اچھے پھلوں کو چھوڑ کر درختوں پر حکمرانی کرنے جاؤں؟...'' (قضاۃ 9-10-11)

مفسرین کا خیال ہے کہ روئے زمین پر انسان کے آنے کے بعد اس کی افادیت کے لیے جو سب سے پہلا درخت اگا وہ درخت انجیر کا تھا۔حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ نے اپنے جسم کی ستر پوشی انجیر کے درخت کے پتوں سے ہی کی تھی۔حدیث شریف میں ابوالدرداؓ حضور پاکؐ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

''نبی کریمؐ کی خدمت میں کہیں سے انجیر سے بھرا تھال آیا۔انھوں نے فرمایا کہ کھاؤ۔ ہم نے اس میں سے کھایا۔پھر آپؐ نے ارشاد فرمایا ''اگر کوئی کہے کہ کوئی پھل جنت سے زمین پر اتر سکتا ہے تو میں کہوں گا کہ یہی ہے۔کیونکہ بلاشبہ یہ جنت کا میوہ ہے۔اس میں سے کھاؤ کہ یہ بواسیر کو ختم کرتا ہے اور گٹھیا (جوڑوں کے درد) میں مفید ہے۔'' (ابوبکر الجوزی)

درود پاک پڑھیے دو جہاں کے سردار حضرت محمدؐ پر جنھوں نے دنیا ہی میں جنت میں پائے جانے والے ایک پھل کا نام بتادیا۔کس مسلمان کی خواہش نہ ہوگی کہ اسے شوق سے کھائے مگر وائے افسوس کتنے لوگ اسے کھاتے ہیں؟ آج آپ بواسیر کے مریض سے ملیے نہ جانے کہاں کہاں اپنے مرض سے نجات پانے کے لیے پریشان ہوتا ہے۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ تھک ہار کر آپریشن کروالیتا ہے۔لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپریشن کے بعد بھی دائمی حل ثابت نہیں ہوتا ہے۔سنجیدگی سے سوچیے کہ کتنے لوگ بواسیر سے نجات پانے کے لیے حفظ ماتقدم کے طور پر انجیر کا استعمال کرتے ہیں۔یہی حال گٹھیا کا ہے کہ بھولے سے بھی اس مرض میں اس پھل کا نام یاد نہیں رہتا ہے۔اب انجیر کے بارے میں مزید معلومات حاصل کی جائے:

یہ ایک ناشپاتی کی شکل کا ہوتا ہے جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں مثلاً ہرا، پیلا، سیاہ، نیلگوں اور سفید وغیرہ۔بہت سے لوگ ناواقفیت کی بنا پر اسے امرود سمجھ بیٹھتے ہیں۔حالانکہ دونوں الگ الگ پھل ہیں۔ انجیر کی کاشت کا بہترین موسم گرمی کا ہے۔یہ تمام پھلوں میں سب سے نازک پھل ہے جس کی مٹھاس بہت زیادہ ہوتی ہے۔انجیر کے اندر دو طرح کی مٹھاس ہوتی ہے۔ایک مٹھاس ایسی ہے جو دوسری مٹھاس کو گلا کر ختم کر دیتی ہے۔ایسی حالت میں یہ ذیابیطس (Diabetes) کے مریض کے لیے نافع ہے۔ساتھ ساتھ جو پھل درخت میں

ہی پک جاتے ہیں اس کی مٹھاس بہت کم ہوتی ہے۔لہٰذا بلا خوف وخطر ذیابیطس کا مریض اسے نوش کر سکتا ہے۔اب آیئے سلسلہ وار انجیر کے کچھ فائدوں پر بات کریں:

1 یہ پھل گردہ اور مثانہ سے پتھری کو حل کر کے نکال دیتا ہے۔ Gall bladder اور Calculus کے مریض خصوصاً توجہ فرمائیں۔

2 یہ زہروں کے اثرات کو بھی زائل کر دیتا ہے۔

3 یہ حلق کی سوزش، پھیپھڑوں کی سوجن اور سینہ کے بوجھ کو دور کر دیتا ہے۔

4 یہ بلغم کو ہلکا کرتا ہے۔ساتھ ہی ساتھ جگر اور تلّی کو صاف کرتا ہے۔

5 بخار کی حالت میں زبان اور حلق خشک ہو رہے ہوں تو اس کے استعمال سے تری محسوس ہوتی ہے۔

6 چھاتی پر پرانی سوزش ہو تو اس کے استعمال سے مرض جاتا رہتا ہے۔

7 یہ گردہ اور مثانہ کی سوزش کے لیے نافع ہے۔

8 انجیر نہار منہ استعمال کیا جائے تو یہ پیٹ سے ہوا نکال دیتا ہے جس سے آنتوں کی گندگی دور ہو جاتی ہے۔

9 اس کے استعمال سے پرانی بلغمی کھانسی کا بلغم آسانی سے نکلتا ہے۔

10 یہ پرانے قبض کو دور کرتا ہے۔

11 یہ مٹاپا کم کرنے کی ایک بہترین دوا ہے۔

12 یہ برص کے داغ کو ختم کر دیتا ہے۔

13 یہ مرگی اور فالج کے مرض کے لیے بہترین دوا ہے۔

14 یہ دمہ کے مرض کے لیے مفید ہے۔

15 یہ خون کی نالیوں کی غلاظت کو دور کرتا ہے۔

16 یہ بھوک بڑھاتا ہے۔

17 یہ حیض کے خون کی بے قاعدگی کے لیے مفید ہے۔ ساتھ ساتھ عورتوں کے دودھ میں بھی اضافہ کرتا ہے۔

18 دماغی بیماریوں کے لیے نافع ہے۔

19 یہ سینے اور پھیپھڑے کو قوت بخشتا ہے۔

20 یہ بدن کو موٹا کرتا ہے اور پیشاب بھی خوب لاتا ہے۔

انجیر میں اللہ نے بہت فائدے رکھے ہیں۔انجیر سے دودھ بھی نکلتا ہے۔اگر دانتوں میں درد ہو تو اس دودھ میں روئی بھگو کر دانتوں پر رکھنے سے درد دور ہو جاتا ہے۔ چہروں کی کیل، مہاسے اور دوسرے داغ دھبے پر یہ دودھ ملنے سے داغ جاتے رہتے ہیں۔انجیر کے درخت کی چھال بھی فائدے میں کچھ کم نہیں ہے۔اگر سر میں درد ہو تو اس کی چھال کو جلا کر راکھ بنالی جائے پھر راکھ کو سرکہ میں ملا کر پیشانی پر لگایا جائے تو دردِ سر جاتا رہتا ہے۔اگر بدن کے کسی حصہ کے زخم کو پکانا ہے تو اس کے پتے کو کوٹ کر لگانے سے زخم پک جاتا ہے۔

یہ تھے انجیر کے مختلف فوائد۔بہتر یہ ہوگا کہ جس مرض کے لیے انجیر استعمال کیا جائے پہلے کسی ماہر طبیب سے رابطہ کر کے اس کے بتائے ہوئے طریقے پر ہی استعمال کیا جائے تاکہ نتائج جلد اور تشفی بخش حاصل ہو سکیں۔ اب جدید یعنی انگریزی دواؤں پر نظر ڈالی جائے تو آپ کو کوئی بھی دوا ایسی نہیں ملے گی جس کے اندر اتنے سارے فوائد موجود ہوں۔ایسی حالت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ آج کا انسان مرض میں مبتلا ہو کر فطری اشیا کو نظر انداز کرتا ہے تو بہت حد تک اس کا ذمہ دار وہ خود بھی ہے۔کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

اس کے کرم تو عام ہیں دنیا کے واسطے
میں کتنا لے سکا یہ مقدر کی بات ہے ■

ماخذ: اوراقِ سائنس، **مصنف:** عبدالودود انصاری، **سنہ اشاعت: ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر وتقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔

'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر وتقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کرسکیں۔ (ادارہ)

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

بسمل عظیم آبادی

دل سے نکلے گی نہ مرکر بھی وطن کی الفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی

لال چند فلک

وطن کی خاک سے مرکر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزا دامان مادر کا ہے اسی مٹی کے دامن میں

چکبست برج نرائن

لہو وطن کے شہیدوں کا رنگ لایا ہے
اچھل رہا ہے زمانے میں نامِ آزادی

فراق گورکھپوری

وطن کی خاک ذرا ایڑیاں رگڑنے دے
مجھے یقین ہے پانی یہیں سے نکلے گا

نامعلوم

یہاں بجلی گرے یا اس چمن میں آندھیاں آئیں
بہر صورت غریبوں کا ہی گھر برباد ہوتا ہے

کلیم عاجز

امارت سے تمھاری کم نہیں قدر اپنی غربت کی
ہماری مفلسی بھی درد کی جاگیر رکھتی ہے

عبدالمتین نیاز

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر

گوپال متل

بٹی ہے آج وراثت میں اینٹ اینٹ اس کی
کس آرزو سے کسی نے یہ گھر بنایا تھا

راسخ عرفانی

وہ تو بتا رہا تھا کئی روز کا سفر
زنجیر کھینچ کر جو مسافر اتر گیا

ہوش نعمانی

کافی ہے اک فقیر کو سایہ درخت کا
اہل ہوس کے واسطے کم ہے جہان بھی

حامی بلڈانوی

تم آسماں کی بلندی سے جلد لوٹ آنا
ہمیں زمیں کے مسائل پہ بات کرنی ہے

شاعر جمالی

کووِڈ لاک ڈاؤن اور ہم بچے

مائشہ

مارچ 2019 کی بات ہے جب سالانہ امتحان کے بعد میرے اسکول میں پی ٹی ایم (والدین اور اساتذہ کی میٹنگ) مقرر کی گئی تھی تو مجھے اس دن کا بے صبری سے انتظار بھی تھا اور تھوڑا ڈر بھی لگ رہا تھا۔ خوشی اس بات کی تھی کہ میں جونیئر سے سینئر اسکول (چھٹی جماعت) میں داخل ہونے جا رہی تھی اور نئے دوستوں سے ملاقات کے مواقع ملنے والے تھے۔ جب کہ ڈر اس بات کا تھا کہ امتحان کے نتیجے کہیں میری امیدوں کے خلاف نہ ہوں۔ اس صورت میں والدین اور اساتذہ کی ڈانٹ سننے کا امکان تھا۔

میری پی ٹی ایم سے ایک دن قبل، کووڈ 19 کے باعث پورے ملک میں مکمل لاک ڈاؤن نافذ کر دیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے پی ٹی ایم بھی منسوخ ہوگئی اور اگلی اطلاع تک اسکول بند رکھنے کا اعلان کر دیا گیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اب مجھے صبح زیادہ دیر تک سونے، اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ کھیلنے اور اپنے پسندیدہ ٹی وی پروگرام 'مسٹر بین' اور 'ٹام اینڈ جیری' دیکھنے کا بھرپور موقع مل سکے گا لیکن وقت کے ساتھ میری خوشی اداسی میں تبدیل ہونے لگی۔ جلد ہی مجھے اپنے ہوم ورک یا کلاس ورک کو مکمل کرنے میں اپنے دوستوں کی مدد اور ان کے ہنسی مذاق اور لطیفوں کی یاد آنے لگی۔ درحقیقت، میں باہر جانے، بیرونی سرگرمیوں میں حصہ لینے اور یہاں تک کہ اپنے آس پاس رہنے والے دوستوں سے ملنے کا موقع نہ ملنے کی وجہ سے مایوس ہونے لگی۔ اب تو ابو دفتر سے آتے وقت چپس، چاکلیٹ اور آئس کریم لاتے تھے اس سے بھی وہ خوشی نہیں مل رہی تھی۔ اپنے دوستوں سے بات کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ یہ صرف میری ہی نہیں بلکہ ہم میں سے تقریباً ہر ایک کی حالت ایک جیسی تھی۔ میں نے اس وبا سے قبل کبھی چہرے کا ماسک استعمال نہیں کیا تھا۔ مجھے جزوی طور پر باہر جانے کی اجازت تھی لیکن یہ حکم تھا کہ میں کم از کم 2 میٹر کا فاصلہ برقرار رکھوں اور گرمیوں میں مناسب چہرے کے ماسک کے ساتھ گھوموں جب درجہ حرارت 38° سینٹی گریڈ سے زیادہ تھا۔ گرمی کے موسم میں ماسک پہننا ایک بے حد مشکل اور تکلیف دہ کام ہے۔

اس وبا نے سماجی سطح پر لوگوں کو الگ تھلگ کر دیا۔ کووڈ کی وجہ سے اسکول کا تعلیمی نظام پوری طرح سے بدل گیا۔ اس دوران میں اسکول کی جانب سے آن لائن کلاسوں کا اعلان میرے لیے راحت کا باعث بنا۔ مہینوں لاک ڈاؤن کے بعد کم از کم اپنے اساتذہ اور دوستوں کو مجھے دیکھنے اور ان کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقع ملا جو ورچوئل ہی سہی پر دلچسپ تھا۔ لیکن تکنیکی اور دیگر مسائل کی وجہ سے یہ جوش زیادہ دیر تک باقی نہیں رہا۔ اپنی کوشش کے باوجود میں پورے وقت اپنی آف لائن کلاسوں کے مقابلے میں آن لائن کلاس پر توجہ نہیں دے پا رہی تھی۔ انٹرنیٹ کی کمزور رفتار اور میرے چھوٹے بھائی اور بہن کی طرف سے کی جانے والی مداخلتیں روزمرہ کا معمول تھیں۔ کئی بار، آن لائن کلاس کے دوران (بہن بھائی) میرا فون پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور کلاسوں میں شرکت کرنے کی بجائے اپنے ساتھ اپنے پسندیدہ کھیلوں میں حصہ لینے کے لیے اصرار کرتے ہیں۔ منع کرنے پر وہ رونا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میری عمر کے بہت سے بچوں کو اس طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

کووڈ نے ہم سے ساری خوشیاں چھین لی ہیں۔ بیماری سے متاثر ہونے کے خوف کی وجہ سے ہم اپنے آبائی وطن کا دورہ نہیں کر سکے۔ رشتے داروں اور دوستوں سے نہیں مل سکے۔ یہ دوسرا موقع ہے جب ہم دادا دادی اور نانا نانی کے ساتھ عید منانے کے لیے اپنے وطن نہیں جا سکے۔ میرے پاس خاندان کے تقریباً ہر فرد سے ملنے والی عیدی سے ڈھیر سارے روپے اور کپڑے جمع ہو جاتے تھے۔ اس وبا نے وہ سب مواقع ختم کر دیے۔ اس بار میں نے پچھلی عیدوں، گھر اور محلے کی چہل پہل، نئے نئے خوب صورت کپڑے پہن کر ہم لوگوں کا پورے محلے میں گھومنا اور گھر کے تمام بڑوں کی طرف سے ملنے والی عیدی کو بہت یاد کیا۔ میں خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ اس وبا کو جڑ سے ختم کر دے، ہر ایک کو محفوظ رکھے اور ہماری پوری دنیا کو کورونا وائرس سے پاک کر دے۔ میں چھٹیوں کے دوران اپنے گھر جانا، بغیر کسی پابندی کے آزادانہ طور پر گھومنا، ریستوران میں بیٹھ کر اپنا پسندیدہ کھانا کھانا اور اپنے اساتذہ، دوستوں اور پسندیدہ لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ میں ان سے بغیر کسی پابندی اور ماسک کے ملنا چاہتی ہوں۔ مجھ سے اب اور انتظار نہیں ہو سکتا۔

■

Maesha
Class: 7
Lady Irwin School
New Delhi- 110001

زیان ایم این شیخ، درجہ ششم، المادانی، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماریہ اقبال، درجہ VII ، کانوینٹ گرلس ہائی اسکول، پٹنہ

انعم ناز، درجہ پنجم، رحمت نگر اقبال اکیڈمی ہائی اسکول، انڈال

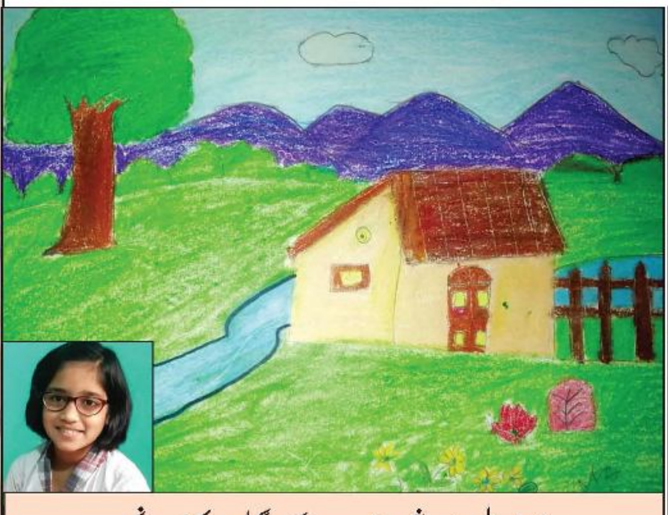

سمراہ عالم، درجہ پنجم، بشپ ویسٹ کوٹ گرلس اسکول، رانچی

جری زیدی، درجہ چہارم، نیشنل جونیئر ہائی اسکول بلیا، اتر پردیش

جنید خان، درجہ چہارم، سید حامد اکیڈمی اسکول، شاہین باغ، نئی دہلی

ایک کلک پر ادب اطفال کا بیش بہا خزانہ

پیارے بچو! آپ کے ذوق کی کتابیں اگر نہیں مل پارہی ہیں تو مایوس نہ ہوں۔ قومی اردو کونسل کے موبائل ایپ (ekitaab) اور ویب سائٹ (https://www.urducouncil.nic.in/) پر آپ کے لیے بہت سی مفید کتابیں موجود ہیں۔ اسے آپ ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ سکتے ہیں۔

बच्चों की दुनिया मासिक, अगस्त 2021, वर्ष 9, अंक 8
BACHON KI DUNIYA Monthly, August 2021 Vol. 09, Issue: 08
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2019-21
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/07/2021
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

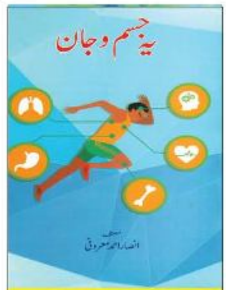

صفحات:51، قیمت:30 روپے

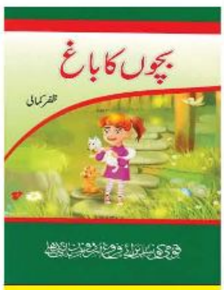

صفحات: 64، قیمت:24 روپے

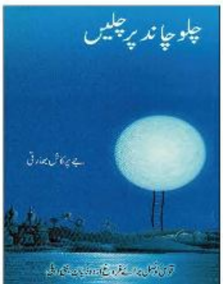

صفحات:48، قیمت:16 روپے

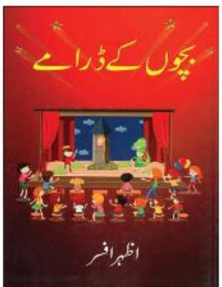

صفحات:124، قیمت:30 روپے

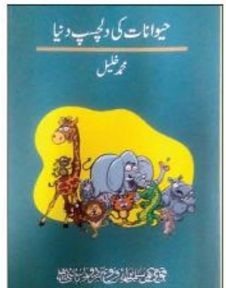

صفحات:83، قیمت:24 روپے

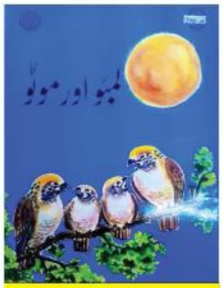

صفحات:61، قیمت:20 روپے

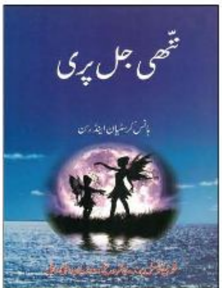

صفحات:33، قیمت:16 روپے

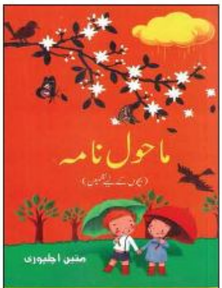

صفحات:82، قیمت:35 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6